علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

علّامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد
پروفیسر یوسف سلیم چشتی
سیّد نذیر نیازی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور ○ فون : 3-5869501

نام کتاب ——— علامہ اقبال اور ہم
طبع اول تا طبع چہارم (اپریل ۷۷ء تا جنوری ۸۵ء) ——— ۱۶,۰۰۰
نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن :
طبع پنجم (جولائی ۱۹۹۵ء) ——— ۲,۲۰۰
طبع ششم (اپریل ۱۹۹۷ء) ——— ۱,۱۰۰
ناشر ——— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقام اشاعت ——— ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰
فون : ۵۸۶۹۵۰۱-۳
مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت (اشاعت خاص : سفید کاغذ، مجلد) ——— ۷۲ روپے
(اشاعت عام : نیوز پیپر ایڈیشن) ——— ۳۰ روپے

مشمولات

- علامّہ اقبال اور ہم (ص۷)
- فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں (ص۳۱)

ڈاکٹر اسرار احمد

* * *

- حیات وسیرت اقبال (ص۶۹)
- فلسفۂ اقبال (ص۷۷)

اور

- ملّتِ اسلامیہ کے نام علاّمہ اقبال کا پیغام (ص۸۹)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

* * *

- اقبال اور قرآن (ص۱۱۷)

سیّد نذیر نیازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

آج سے لگ بھگ ۲۱ سال قبل ۲۳/ مئی ۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس کے مرکزی مقرر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تھے۔ یہ ایک یادگار خطاب تھا جس میں محترم ڈاکٹر صاحب نے نہایت منفرد انداز میں مسلمانانِ پاکستان اور علامہ اقبال کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ اقبال بلاشبہ مصور و مجوزِ پاکستان تو تھے ہی، وہ قافلۂ ملی کے ایک عظیم حدی خواں اور ایک بلند پایہ "ترجمان القرآن" بھی تھے۔ اس اعتبار سے پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان نہ صرف یہ کہ علامہ اقبال کے ساتھ ایک سہ گونہ رشتے میں منسلک ہے بلکہ وہ تین جہات سے اقبال کے زیر بارِ احسان بھی ہے۔ اس فکر انگیز خطاب کو بعد میں مرتب کر کے "علامہ اقبال اور ہم" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

علامہ مرحوم کے ساتھ محترم ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا اہم ترین سبب علامہ کا فکرِ قرآنی ہے۔ انہوں نے افکارِ قرآنی کو اپنے اشعار میں جس طرح سمویا وہ انہی کا حصہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو ایک پیغام دیا اور جسدِ ملی میں ایک نئی روح پھونکی، لیکن اس بات سے شاید بہت کم لوگ واقف ہوں کہ اقبال درحقیقت ترجمانِ قرآن تھے، ان کا پیغام بھی تمام تر افکارِ قرآنی ہی سے عبارت ہے۔ چنانچہ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اپنے پرتاثیر کلام کے ذریعے مسلمانانِ برصغیر کو قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا، انہیں قرآن کے انقلابی فکر سے روشناس کرانا اور اس طرح اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہ ہموار کرنا فی الاصل اقبال کے پیش نظر تھا۔ اسی حقیقت کا نہایت شدت کے ساتھ انکشاف محترم ڈاکٹر صاحب پر بھی ہوا کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ چنانچہ وہ اس معاملے میں علامہ مرحوم کو بجا طور پر اپنا پیش رو قرار دیتے ہیں اور ان کی عظمت کے واشگاف الفاظ میں اظہار و اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید میں سب سے بڑا حصہ علامہ اقبال کا ہے۔ مسلمان بحیثیتِ مجموعی اس اہم حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں، دین ہے جو پورے نظامِ اجتماعی پر اپنا غلبہ و اقتدار چاہتا ہے۔ اقوامِ مغرب کی غلامی نے انہیں اس درجے پست ہمت اور کوتاہ فکر بنا دیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی نماز روزے پر ہی قانع ہو کر رہ گئے تھے اور اسی کو کل اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ "تکبیرِ رب" جیسے ولولہ انگیز انقلابی تصور کو

مسلمان نے تسبیح و وظائف تک محدود کر دیا تھا۔ اقبال نے بڑے زوردار انداز میں دین و مذہب کے اس محدود تصور پر ضرب لگائی اور نہایت دلنشیں پیرائے میں دین کے اصل تصور کو اجاگر کیا:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل   یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست   یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

فکرِ اقبال کے ان گوشوں سے محترم ڈاکٹر صاحب کو خصوصی دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی انہیں کسی فورم سے اقبال کے موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اس دعوت کو قبول کیا۔ مرکزیہ مجلسِ اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام یومِ اقبال کی تقریب میں متعدد بار وہ مہمان مقرر کی حیثیت سے خطاب کر چکے ہیں---اس ضمن میں ۲۱/اپریل ۸۶ء کو الحمرا ہال میں یومِ اقبال کی تقریب میں "فکرِ اقبال کی روشنی میں 'حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے انہوں نے ایک مبسوط مقالہ تحریری شکل میں پیش کیا تھا جو بعد میں "میثاق" میں بھی شائع ہوا۔ اس فکر انگیز مقالے کو بھی زیرِ نظر کتاب کے اس تازہ ایڈیشن میں شامل کر لیا گیا ہے۔

بات نامکمل رہے گی اگر "فکر اسلامی کی تجدید اور علامہ اقبال" اور "فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ" کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کی ان دو تحریروں کا ذکر نہ کیا جائے جو اب ان کی کتاب "برِ عظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" کی مستقل جزو ہیں۔ بحیثیتِ مجددِ فکرِ اسلامی اقبال کا کردار ان تحریروں کے ذریعے زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ تحریریں اولاً اخباری کالموں کی صورت میں ۹۲ء کے نصفِ آخر میں روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہوئیں اور پھر مذکورہ بالا کتاب کا حصہ بن گئیں۔ علامہ اقبال کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو پورے طور پر جاننے کے لئے ضروری ہو گا کہ زیرِ نظر کتاب کے ساتھ ساتھ ان تحریروں کو بھی نظر سے گزار لیا جائے۔ ان مقالات و مضامین کے مابین جن کا اوپر ذکر کیا گیا، اگرچہ اچھا خاصا زمانی فصل اور بُعد موجود ہے کہ پہلا مضمون "علامہ اقبال اور ہم" ۷۴ء کا مرتب کردہ ہے، دوسرا مقالہ "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ" اس کے ۱۲ سال بعد ۸۶ء کا تحریر کردہ ہے اور ان حالیہ تحریروں کی تسوید جن کا اوپر حوالہ دیا گیا، مزید ۶ سال بعد یعنی ۱۹۹۲ء کے اواخر میں ہوئی، لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان تمام مضامین و مقالات میں فکری اعتبار سے کوئی تناقض و تباین نہیں ہے، بلکہ ایک واضح فکری تسلسل موجود ہے جو بلاشبہ ایک نہایت قابلِ قدر بات ہے!

علاوہ ازیں زیرِ نظر کتاب میں شارحِ کلامِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے بعض نہایت وقیع مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں کہ جن کے ذریعے اقبال کی شخصیت، ان کا فلسفۂ خودی

اور ملتِ اسلامیہ کے نام اقبال کے پیغام کا ایک جائزہ نہایت جامعیت اور عمدگی کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ ان مضامین سے متعلق خاص بات یہ ہے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں اس وقت سپرد قلم کئے گئے جب علامہ اقبال مرحوم ابھی بقیدِ حیات تھے۔ چشتی صاحب مرحوم ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضری کا مسلسل موقع ملتا رہا۔ لہٰذا اقبال اور افکارِ اقبال کے بارے میں چشتی صاحب مرحوم کے مضامین غیر معمولی اہمیت و وقعت کے حامل ہیں۔ یہ مضامین "میثاق" کی پرانی فائلوں میں دبے ہوئے تھے، زیرِ نظر کتاب میں انہیں اس خیال سے شامل کیا جا رہا ہے کہ یہ قیمتی علمی مضامین ضائع ہونے سے بچ جائیں اور لوگوں کے لئے ان سے استفادہ کرنا بسہولت ممکن ہو سکے۔---- علامہ سے قرب رکھنے والے ان کے ایک اور ارادت مند جناب سید نذیر نیازی مرحوم کا وقیع مضمون "اقبال اور قرآن" بھی اسی غرض سے شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کا یہ تازہ ایڈیشن اپنے حجم کے لحاظ سے پہلے کے مقابلے میں کم و بیش تین گنا ضخامت کا حامل ہے۔

یادش بخیر، چند سال قبل ایران کے مشہور مفکر و دانشور ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم کی اقبال کے موضوع پر ایک کتاب نظر سے گزری۔ ڈاکٹر شریعتی کے بارے میں یہ بات اکثر احباب کے علم میں ہوگی کہ ایران کے حالیہ انقلاب کے لئے فکری و نظری غذا انہوں نے ہی فراہم کی تھی۔ ان کے انقلابی افکار جو مختصر کتابچوں کی صورت میں نہایت سرعت کے ساتھ ایران کے طول و عرض میں پھیلے، انقلابِ ایران کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اقبال کے فارسی کلام اور فلسفہ و فکر سے شدید طور پر متأثر تھے اور خود انہوں نے بہت کچھ فکری غذا اقبال سے حاصل کی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اقبال اور اس کے افکار پر انہوں نے جو کتاب مرتب کی اس کا نام بھی بعینہٖ وہی رکھا جو محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے لئے ۱۹۷۷ء میں تجویز کیا تھا، یعنی "ما و اقبال"۔ جس کا سیدھا سادا ترجمہ یہی بنتا ہے: ہم اور علامہ اقبال! ○○

ناظم نشر و اشاعت
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۱۴ جولائی ۹۵ء

علامہ اقبال مرحوم

اور

ہم

اسرار احمد

ایک تقریر جو ۳ر مئی ۱۹۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور
میں ایک اجتماع منعقدہ بیادِ علامہ اقبال مرحوم میں
زیرِ صدارت پروفیسر اشفاق علی خاں کی گئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ مسنونہ اور دُعا کے بعد:

صدر گرامی قدر، مہمانانِ گرامی، محترم پرنسپل صاحب، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ!

اگرچہ پاکستان کی اس مشہور درس گاہ میں اس سے قبل متعدد بار خطاب کا موقع مل چکا ہے تاہم مجھے شدید احساس ہے کہ آج کے اس اجلاس سے جو بیادِ علامہ اقبال مرحوم منعقد ہو رہا ہے، میرا خطاب کرنا ایک غیر معمولی جرأت ہی نہیں کسی قدر نامناسب جسارت بھی ہے۔

اس کا سبب بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ میں نہ زبان و ادب کے میدان کا آدمی ہوں نہ فکر و فلسفے کا، بلکہ میری بنیادی تعلیم سائنس کی ہے اور ثانوی تربیت طب و علاج کی۔ جبکہ علامہ اقبال کی دو سب سے زیادہ معروف حیثیتیں یہی ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور ایک عظیم فلسفی اور مفکر بھی۔ لہٰذا علامہ مرحوم کے بارے میں میری تقریر کچھ انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ بایں ہمہ، جب مجھے اس تقریب میں حاضر ہو کر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے بغیر کسی پس و پیش یا رد و قدح کے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان، قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے اور بالکل اَن پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ مرحوم کے ساتھ سہ گانہ و سہ گونہ رشتوں میں منسلک ہے:

ایک یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمینِ پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزیں ہیں، اس کا وجود و قیام علامہ مرحوم ہی کے تخیل و تصور کا رہینِ منت ہے ——

دوسرے۲ یہ کہ وہ عالمی ملّتِ اسلامی اور امّتِ مرحومہ جس سے ہم سب منسلک ہیں، اس دَور میں اس کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں بھی اقبال ہے اور اس کے اِحیاء و نشاۃِ ثانیہ کا سب سے بڑا حُدی خواں بھی اقبالؔ ہی ہے ——— تیسرے۳ یہ کہ وہ دینِ حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں کچھ ہی پہلے حالیؔ مرحوم نے کہا تھا:

؎ جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے!
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اس دَور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا راز داں بھی اقبالؔ ہی ہے اور اس کی روحِ باطنی اور جسدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبالؔ ہی کو حاصل ہے!

یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبالؔ سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدیدِ ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ اور تشکیلِ جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد، دونوں کا اصل مبنیٰ و مدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہیے اور میں دیکھتا ہوں کہ ملّتِ اسلامی اور دینِ حق دونوں کے اِحیاء اور نشاۃِ ثانیہ کے اس طرح قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ مرحوم کو تھا۔ یغفرُ اللّٰہ لہٗ و یرحمہٗ!!

خلاصۂ کلام یہ کہ ——— میں نہ علامہ مرحوم کی شاعری اور ان کی فصاحت و بلاغت یا قدرتِ کلام کے بارے میں کسی ماہرِ فن ناقد کی حیثیت سے کچھ عرض کرنے کا مجاز ہوں ——— نہ ان کے فکر و فلسفے پر خالص فلسفیانہ انداز میں کوئی تبصرہ کر سکتا ہوں ——— بلکہ میں مذکورہ بالا چار نسبتوں ہی کے بارے میں کچھ مختصراً عرض کروں گا:

(۱)

مصوّرِ پاکستان

سب جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے، بلکہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے مزاج کو عملی سیاست کے ساتھ سازگار نہ بنا سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے برصغیر ہندوپاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ ؁۳۰ء سے قبل تو سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے، اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہِ دُوررس و دُوربین تھی جس نے حالات کے رُخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خودمختار مملکت قائم کی جائے!

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف "مصوّر" کا نہیں، اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اگرچہ خود عملی سیاست کے مردِ میدان نہ تھے، تاہم حالات کی صحیح نبّاضی اور ان کی سیاسی بصیرت کا دوسرا شاہکار یہ ہے کہ انہوں نے موجود الوقت حالات میں مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی کے لیے صحیح ترین وکیل، ڈھونڈ نکالا اور نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہِ دُوررس نے مسلمانانِ ہند کی قیادتِ عظمٰی کے لیے محمد علی جناح مرحوم کو تاکا بلکہ خود اُن میں اپنی اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اور یہ تو بلاشبہ علامہ مرحوم کے غایتِ خلوص و اخلاص کا بیّن ثبوت اور ان کے حد درجہ انکسار اور تواضع کی دلیلِ قاطع ہے کہ انہوں نے اس قائد کے ساتھ اس کی تنظیم کے ایک صوبائی صدر کی حیثیت سے کام کرنا بھی منظور کر لیا حالانکہ ان کے مزاج کو اس قسم کے کاموں کے ساتھ کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ اس طرح علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصور پیش کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی

جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں بنفسِ نفیس شرکت بھی کی اور گویا 'تحریکِ پاکستان' کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اُس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیتِ قوم خود پاکستان ہی کی قدر نہ کی، علامہ کے احسان کو کیا یاد رکھتے۔ کاش کہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ مملکتِ خداداد پاکستان اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ مرحوم کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا۔

ہماری اسی ناقدری کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کا ایک بازو نہ صرف یہ کہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا بلکہ کم از کم فوری طور پر اس کی کامل قلبِ ماہیت بھی ہو گئی اور اس نے ایک اسلامی یا اس سے بھی کمتر درجے میں ایک مسلمان مملکت کے بجائے ایک لادینی، قومی، سوشلسٹ ریاست کا روپ دھار لیا۔ اس حادثۂ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح "ہزار سالہ شکست کے انتقام" سے تعبیر کیا گیا اس سے اُن لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے۔ اگر مسز اندرا گاندھی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے، یہ الفاظ زبان سے نکال سکتی ہے تو "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا" کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست متعصب مزاج ہندو اکثریت کا رویہ اگر اسے ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا، تو کیا ہوتا!

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اب تک ہندوستان سے اسلام کا صفایا ہو چکا ہوتا بلکہ پورا شرقِ وسطیٰ ہندو امپیریلزم کے سیلاب کی زد میں ہوتا۔

علامہ مرحوم نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں فرمایا تھا:

؎ وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تو اگرچہ شخصاً تو علامہ مرحوم کا کوئی مقابلہ یا موازنہ حضرتِ مجددؒ کے ساتھ خارج از بحث ہے، تاہم اگر یہ کہا جائے کہ خاص طور پر "ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی" کے اعتبار سے علامہ مرحوم کو ایک

نسبتِ خصوصی حضرت مجدد کے ساتھ حاصل تھی یا یہ کہ علّامہ مرحوم کی شخصیت کا یہ پہلو حضرت مجدد کے ساتھ ان کی والہانہ محبّت اور عقیدت ہی کا مظہر ہے تو غالباً یہ غلط نہ ہوگا۔

(۲)

قافلۂ ملّی کا حُدی خواں

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کے پیشِ نظر یہ بات بڑی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے قومی مسائل کا ذکر علامہ مرحوم کے اشعار میں کہیں موجود نہیں ہے اور اپنے اشعار میں وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ کے نقیب اور قافلۂ ملّی کے حُدی خواں نظر آتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی شاعری کے دَورِ اوّل میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہ صرف یہ کہ ان کا جذبۂ حُبّ الوطنی چھلکا پڑتا ہے بلکہ باقاعدہ ہندی قوم پرستی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ لیکن 'بانگِ درا' ہی کے نصفِ آخر میں دفعتہً وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ کے ترجمان و حُدی خواں کی حیثیت سے نمودار ہو جاتے ہیں اور "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اور "میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!" کی جگہ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا وجد آفریں ترانہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین ہندوستان کے مسلمانوں کے جُداگانہ قومی تشخّص کا مسئلہ جو ان کے سیاسی فکر کا مرکز و محور ہے، ان کے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتا۔

میرے نزدیک یہ تصور پسندی (IDEALISM) اور حقیقت بینی (REALISM) کا حسین ترین امتزاج ہے جس سے ہمیں علامہ مرحوم کی شخصیت متّصف نظر آتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ یہ "اَصْلُھَا ثَابِتٌ" اور "فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ"[1] کی عمدہ مثال ہے کہ ایک جانب فکر و خیال انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہوں اور دوسری طرف انسان کا تعلق اپنے نزدیکی ماحول کے تلخ حقائق سے بھی منقطع نہ ہونے پاتے۔

---

[1] سورۂ ابراہیم کی ایک تمثیل سے ماخوذ: ترجمہ "اس کی جڑ جمی ہوتی ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں!"

علامہ مرحوم کی ملی شاعری میں، جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا تھا، دونوں رنگ موجود ہیں، مرثیہ خوانی کا بھی اور حُدی خوانی کا بھی ———— پہلے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ انہوں نے شبلی و حالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا اور ملتِ اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور اُمتِ مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت مؤثر اور دلدوز انداز میں کھینچا۔ مثال کے طور پر حالی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے   اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے   پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے   اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اور پھر پڑھیے وہ نظم جو "صقلیہ" (جزیرہ سسلی) پر علامہ مرحوم نے کہی اور اندازہ کیجیے اقبال کی ملی مرثیہ خوانی کا!

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار!   وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی   بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے   بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اِک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور   کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا   آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یا پڑھیے 'بانگِ درا' میں اس کے قریب ہی کی وہ نظم جو "بلادِ اسلامیہ" کی یاد میں کہی گئی۔ اور جس میں دلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ ایسے عروس ہائے بلاد میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر انتہائی رقت انگیز پیرائے میں اُمتِ مسلمہ کی عظمتِ گزشتہ و سطوتِ پارینہ کا مرثیہ پڑھا گیا۔

یا پڑھیے علامہ اقبال کی وہ طویل نظم جو "مسجدِ قرطبہ" کے عنوان سے 'بالِ جبریل' میں شامل ہے۔ اس میں فکر و خیال کی عام بلند پروازی کے علاوہ جذبۂ ملی کی جو بے قراری از ابتدا تا انتہا جاری و ساری

ہے اس سے بھی قطع نظر صرف وہ اشعار پڑھیے جو براہِ راست مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہے گئے ہیں، اور اندازہ کیجیے جذباتِ ملّی کے اس طوفان کا جو اس "کافرِ ہندی" کے قلب میں موجزن تھا!! اور غور کیجیے اس کے دو آخری بندوں پر کہ کس خوبصورتی کے ساتھ امّتِ مرحومہ کی تجدید و احیاء کا پیغام دیا گیا اور کیسے جذبہ پرور انداز میں ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی دعوت دی گئی۔

اور یہی دراصل علامہ مرحوم کی ملّی شاعری کا وہ مثبت اور تعمیری پہلو ہے جو انہیں ملّت کے سابق مرثیہ خوانوں سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ علامہ کے یہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں انتہائی ولولہ انگیز پیغامِ عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی ہے جس نے یاس اور قنوطیت کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا اور دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیئے۔

یوں تو علامہ کے اشعار میں یہ امید افزا پیغام گویا رچا بسا ہوا ہے، چنانچہ بانگِ درا کے متوسط حصّے میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے کہ:

؎ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اور

؎ اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

لیکن خاص طور پر "طلوعِ اسلام" تو گویا از اوّل تا آخر ایک 'طبلِ رحیل' ہے:۔

؎ سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور

؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ مرحوم کی یہ ملی شاعری، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، حدودِ ارضی سے بالکل آزاد ہے اور ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطۂ ارضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور کرتا ہوگا۔ گویا ان کی شاعری "وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ[1]" کے ہر شائبے سے بالکل پاک ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ:۔

طہران[2] ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

لیکن دوسری طرف اپنے گرد و پیش سے بھی بے خبر نہیں ہے بلکہ حالات کی نبض پر ہاتھ دھرے مسلمانانِ ہند کے مسائل کی تشخیص بھی کر رہا ہے اور ان کا حل بھی پیش کر رہا ہے!

ملّتِ اسلامیہ کی تجدید اور اُمّتِ مرحومہ کی نشأۃ ثانیہ کی جو فوری امید علامہ کو تھی، محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے آخری دَور میں اسے بہت سے صدموں سے دوچار ہونا پڑا اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بعد میں ایک قسم کی ناامیدی اور یاس کی سی کیفیت بھی علامہ مرحوم پر طاری ہو گئی تھی، جو مثلاً اس قسم کے اشعار سے ظاہر ہے کہ:

؎ نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

اور

---

[1] سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۶ کا ایک ٹکڑا۔ ترجمہ "لیکن وہ تو زمین کی جانب ہی جھکتا چلا گیا!"

[2] یہ دُوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت طہران کی بجائے ارضِ لاہور کو عطا فرما دی جہاں ملّتِ اسلامیہ کا یہ حُدی خواں مدفون ہے۔ ابھی جو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کے موقع پر جناب وقار انبالوی نے علامہ مرحوم کی روح سے خطاب کر کے کیا خوب کہا ؎

اے دیدۂ بیدارِ خودی! مردِ قلندر! رحمت ہے خدا کی ترے افکارِ مبیں پر
لاہور بنا ہے تری مِلّت کا جنیوا کیا رنگِ بہاراں ہے گلستانِ یقیں پر
تعبیر سے ہم دوش ہے اقبال ترا خواب مسرور ہو تو خلد میں جمعیتِ دیں پر

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج‘ دیکھ چکا صدف صدف!

لیکن اس کا اصل سبب یہ ہے کہ علامہ مرحوم نابغہ (GENIUS) اشخاص میں سے تھے، جن کے بارے میں یہ مسلّم ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے زمانے سے قدرے بعد کی باتیں کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں تیس چالیس سال کا عرصہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ علامہ مرحوم نے جس دور کا خواب دیکھا تھا اس کی ابتدا ہو رہی ہے[1]۔

---

[1] (پ۔ ن۔ نومبر ۹۴ء) یہ بات راقم نے ۲؍مئی ۱۹۷۳ء کو کہی تھی اور بحمد اللہ ایک سال سے کم مدت کے اندر اندر اس کی دو عظیم شہادتیں بھی رونما ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ایک طرف اکتوبر ۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں ایک بالکل نیا نقشہ دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ چنانچہ وہی عرب جو بزدل اور بھگوڑے مشہور ہو گئے تھے، ان کی بہادری، جرأت اور جانبازی کے چرچے عام ہو گئے اور وہ عالمِ عرب جس کا اختلاف و افتراق ضرب المثل بن چکا تھا دفعۃً ایک متحد قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آن کھڑا ہوا —— یہاں تک کہ یہ "کنجشکِ فرومایہ" تیل کا ہتھیار استعمال کر کے امریکہ ایسے "شاہین" سے لڑ گیا! دوسری طرف فروری ۷۴ء کی عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور نے عالمِ اسلام کے اتحاد کا ایک نہایت دلفزا منظر چشمِ عالم کے سامنے پیش کر دیا جس کی اہمیت کا اصل اندازہ اس سراسیمگی سے لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت بھارت اور اس کے کارپردازوں پر طاری ہو گئی تھی۔

یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اقبال ہی کے ان اشعار کے مصداق کہ "دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا! اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسہ۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!" دنیا کی ابلیسی قوتوں نے احیاءِ دین و ملت کی اس چڑھتی لہر کو نہ صرف روک دیا بلکہ پسپائی پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس کے بعد سے اب تک یہ لہر اتار اور چڑھاؤ کے کئی ادوار سے گزر کر بہرحال اس حد تک آگے بڑھ آئی ہے کہ پوری مغربی دنیا "مسلم فنڈامنٹلزم" سے خائف نظر آتی ہے۔ اور اگرچہ ابھی احیاءِ دین و ملت کا یہ عمل مستقبل قریب میں بعض بڑے بڑے صدمات سے دوچار نظر آتا ہے تاہم بالآخر جو نویدِ جانفزا اقبال نے دی تھی وہ الفاظِ قرآنی "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" اور احادیثِ نبویہ میں وارد شدہ پیشینگوئیوں کے مطابق لازماً پوری ہو کر رہے گی۔ اور ع "بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے!" کے مصداق حوادث و واقعاتِ عالم کی تیز رفتاری بتا رہی ہے کہ بالآخر پورے کرۂ ارضی پر "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نظام کا قیام اب بہت زیادہ دور نہیں ہے!

(اسرار احمد ۸؍ نومبر ۹۴ء)

(۳)

رومیِ ثانی

جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارفِ ایمانی اور علم و حکمتِ قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم رومیِ ثانی تھے! انہوں نے علی الاعلان مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا ہے اور "پیرِ رومی" کے ساتھ بحیثیت "مریدِ ہندی" ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر قدرے فخریہ انداز میں بھی کیا ہے یعنی ؏

برہمن زادۂ رمز آشنائے رُوم و تبریز است! * (۱)

اب اگر مثنوی مولانا روم کے بارے میں عارف جامی کے یہ اشعار مبنی بر حقیقت ہیں کہ:

مثنویِ مولویِ معنوی   ہست قرآں در زبانِ پہلوی (۲)
من چہ گویم وصفِ آں عالیجناب   نیست پیغمبر ولے دارد کتاب (۳)

تو یقیناً علامہ اقبال مرحوم بھی دورِ حاضر کے "ترجمان القرآن" قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

علامہ مرحوم خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ ان کے اشعار فکر و پیامِ قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتماد ہے کہ انہوں نے 'مثنوی اسرار و رموز' کے آخر میں "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ" کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است (۴)
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کن (۵)
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا! (۶)

آخری مصرع کو پڑھ کر ہر وہ شخص کانپ اٹھتا ہے جسے کسی بھی درجے میں علامہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اندازہ ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں نے جب بھی یہ اشعار پڑھے ایک مرتبہ ضرور جھرجھری سی آ گئی اور دل لرز اٹھا کہ اللہ اکبر! اپنے حق میں اتنی بڑی بددعا! لیکن پھر اس خیال سے تسکین ہوتی رہی کہ دراصل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو کس

---

* فارسی اشعار کا ترجمہ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

درجہ پختہ یقین تھا اس بات پر کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے[1]

۱ــــ رُوحِ دین کی تشریح و تعبیر

جہاں تک روحِ دین کی تشریح و تعبیر کا تعلق ہے علامہ مرحوم کی خدمات کو منفی و مثبت دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ــــ چنانچہ ایک طرف انہوں نے بنیادی اعتقادات اور اساسی فکر کے ضمن میں ہمہ اوستی نظریات اور شیخ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی عامیانہ تعبیرات کی پُرزور تردید کی اور جواباً وہ نظریہ پیش کیا جو اقبال کے فلسفۂ خودی کے نام سے موسوم ہے اور اصلاً حضرت مجددؒ کے نظریۂ وحدت الشہود سے مشابہ ہے ــــ اور دوسری طرف عبادات کے میدان میں نری رسم پرستی (RITUALISM) کی زوردار نفی کی اور اثباتاً عبادت کی اصل رُوح یعنی عشق و محبتِ خداوندی پر زور دیا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک ہمہ اوست کی مختلف تعبیروں کے مابین فرق یا ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی باریکیوں کا تعلق ہے، ان کی وضاحت کا یہ مناسب موقع ہے

---

[1] یہاں راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چند سال قبل جب مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ آنکھ کے آپریشن کے لیے لاہور میں مقیم تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی تو فرصت کے اس وقت کا مصرف مولانا نے یہ نکالا کہ علامہ اقبال کا پورا اُردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ لاہور کے تمام رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر طویل عرصے تک ایک خاص کیفیت مولانا پر طاری رہی اور حسبِ عادت مولانا نے اپنے تاثر کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا کے تاثر کی شدت کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل دو جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو راقم الحروف کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:

ایک[1] یہ کہ ”قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ گمان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!“ دوسرے[2] یہ کہ ”اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اس اُمت میں پیدا ہوا لیکن یہ اُمت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہوگا!“ (اسرار احمد)

نہ ہی میں اس کا اہل ہوں اور نہ ہی اس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسائل بہت دقیق ہیں اور ان کا سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اصل خرابی اس طرح واقع ہوئی کہ ان نظریات کا پرچار اشعار کے ذریعے کیا گیا جو زبان زدِ خواص و عوام ہو گئے۔ اب خواص نے تو انہیں ہضم بھی کر لیا اور رچا پچا کر جزوِ بدن بھی بنا لیا لیکن عوام کے لیے یہ زہر ہلاہل بن گئے اور انہوں نے ان کو عمل سے گریز اور فرار کا بہانہ بنا لیا۔

اقبال کا جہاد اصلاً ان نظریات کے اُن عمومی اثرات ہی کے خلاف ہے جو حافظؔ اور جامیؔ کے اشعار کے ذریعے عوام کے اذہان پر مترتّب ہوئے اور جن کے نتیجے میں اُمّت کے ایک بڑے حصے میں سُکر، جذب، مستی اور بالآخر فنا کا ذوق تو پیدا ہو گیا لیکن عمل اور جہاد کا جذبہ ختم ہوتا چلا گیا۔

فلسفۂ خودی

بدقسمتی سے علامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی نے مختلف بلکہ متضاد تشریحوں اور تعبیروں کے باعث ایک چیستاں کی صورت اختیار کر لی ہے اور معاملہ بالکل وہی ہوا ہے کہ

ع "شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا!"

آسان تفہیم کے لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کے فلسفے کا بنیادی پتھر انسان کی ہستی کی نفی کے بجائے اثباتِ ذاتِ خویش ہے۔ نتیجۃً ان کے پیشِ نظر 'سلوک' کی انتہائی منزل "فنا فی اللّٰہ" نہیں بلکہ "بقا باللّٰہ" ہے۔

اس نکتے کی وضاحت کے لیے اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے میں خود علامہ مرحوم کی اس تحریر کے بعض حصّے آپ کو سناتا ہوں جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی اس فرمائش پر کہ علامہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبانِ انگریزی تحریر کر دیں، سپردِ قلم کی تھی اور جسے پروفیسر موصوف نے 'مثنوی اسرارِ خودی' کے ترجمے (SECRETS OF THE SELF) کے شروع میں شائع بھی کر دیا تھا (مطبوعہ ۱۹۲۱ء)۔ اپنی اس تحریر میں علامہ فرماتے ہیں:

> "ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں میرا یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور اربابِ وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیاتِ کلّی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی کو مٹا دے ——— میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی

ہستی کو قائم رکھے۔۔۔ قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے[1]۔۔۔ میں نے افلاطون کے فلسفے پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔۔۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنالے، اس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبے کو پہنچ جاتے گا[2]۔۔۔"

میں اگر اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کروں تو وہ یوں ہوگی کہ اس پورے سلسلۂ کائناتِ مادی اور تمام عالمِ کون و مکان کی طرح خود انسان کا مادی وجود یا اس کا وجودِ حیوانی بھی خالص وہمی و خیالی اور اعتباری محض ہے، سوائے اس کی آنا یا مَن یا ذات یا خودی کے جو دراصل عبارت ہے اس کی اُس رُوح سے جو اس کے وجودِ حیوانی میں پھونکی گئی اور جس کی اضافت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی طرف کی ہے بلفحوائے آیۂ قرآنی: "فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ[3]" یعنی جب میں اس کو پوری طرح درست کردوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں!۔۔۔۔ یہ روحِ انسانی نہ وہمی و خیالی ہے نہ عارضی و فانی بلکہ حقیقی اور واقعی بھی ہے اور دائم و باقی بھی! خدا یا روحِ کائنات یا انائے کبیر اور اس روحِ انسانی یا انائے صغیر میں ایسا قریبی رابطہ اور لازم و ملزوم کا رشتہ ہے کہ انسان اسے

---

[1] ۱: یہاں علامہ مرحوم نے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" کا حوالہ بطور حدیثِ رسولؐ دیا ہے لیکن اصلاً یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں بلکہ صوفیا کے ایک مشہور مقولے کے ہیں!

۲: غالباً یہی مفہوم ہے علامہ مرحوم کے اس مشہور مصرع کا کہ ؎ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

[2] یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

[3] سورۃ الحجر آیت ۲۹ اور سورۃ ص آیت ۷۲

پہچان لے تو خدا کو جان جاتا ہے[1] اور اگر اسے نہ پہچان پائے تو کبھی خدا کی معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یا عکسائیوں کہہ لیں کہ اگر کوئی خدا کو پہچان لے تو اپنی عظمت سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر خدا کو بھلا دے تو اپنی حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے[2]

خالق و مخلوق اور عبد و معبود یا انائے کبیر اور انائے صغیر یا علامہ کے الفاظ میں انائے مطلق (INFINITE EGO) اور انائے محدود (FINITE EGO) کے مابین اصل رشتہ باہمی عشق اور محبت کا ہے بمصداق آیاتِ قرآنی:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ	اور (حقیقی) ایمان والے سب سے زیادہ
حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرة:۱۶۶)	شدید محبت کرتے ہیں خدا کے ساتھ!
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ	یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے[3] ان لوگوں سے
فِیْ سَبِیْلِهٖ (الصف:۵)	جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں ....

اور اسی باہمی رشتۂ الفت و محبت کا مظہرِ خارجی ہے جسے قرآن "ولایتِ باہمی" سے تعبیر کرتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرة:۲۵۸)	اللہ اہلِ ایمان کا ولی ہے۔
اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ	آگاہ ہو جاؤ اللہ کے ولیوں کے لیے نہ کوئی
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲)	خوف ہے نہ حزن!

اب ظاہر ہے کہ جس کسی کو اس عشق کی حقیقی لذت حاصل ہو گئی وہ اس کے دوام و بقا کا خواہشمند ہوگا نہ کہ اس کے انقطاع اور خاتمے کا! اور ظاہر ہے کہ بقائے عشق بقائے ذات پر منحصر ہے اور

---

[1] یہ ترجمہ ہے صوفیاء کے اس مقولے کا جو عموماً حدیثِ رسول کی حیثیت سے بیان کر دیا جاتا ہے یعنی:
"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ"

[2] یہ ترجمہ ہے آیۂ قرآنی کا "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝" (سورۃ الحشر آیت ۱۹)

[3] اس آیۂ کریمہ کو پڑھتے ہوئے میرا ذہن علامہ مرحوم کے اس شعر کی جانب لازماً منتقل ہو جاتا ہے کہ ؎
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

فنائے ذات کا لازمی نتیجہ خاتمۂ عشق ہے۔ بس یہیں سے علامہ مرحوم کے فلسفے کا دوسرا اہم نکتہ سمجھ میں آسکتا ہے یعنی عشقِ خداوندی اور اس کا دوام اور محبتِ الٰہی اور اس کا "سوزِ ناتمام"۔ ؎

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل   چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام! (۷)
یا   دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است   چو ماہی جز تپش بر ما حرام است! (۸)
یا   ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی،   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

الغرض اثباتِ ذاتِ خویش اور دوامِ عشقِ الٰہی علامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کے دو ستون ہیں، اور یہ دونوں ظاہر ہے کہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ علامہ کے ان دو اشعار میں ان کا یہ باہمی لزوم بہت نمایاں ہے یعنی ؎

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن   دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی!

اور ؎

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی   کہ میری زندگی کیا ہے، یہی طغیانِ مشتاقی!

یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ اسی عشقِ الٰہی کا ایک عکس عشقِ رسولؐ بھی ہے۔ اس لیے کہ کون ہے جو نہیں جانتا کہ اطاعت و محبت دونوں کے اعتبار سے اللہ اور رسولؐ ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ مرحوم کے کلام میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ تانے بانے کے مانند پیوست ہے۔ جیسے ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ ساماںِ اوست   بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست! (۹)
یا   بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است! (۱۰)

روحِ شریعت: عشقِ الٰہی

روحِ دین کی تعبیر کے ضمن میں، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، علامہ مرحوم کی دوسری بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے نری رسم پرستی اور خشک فقہی و قانونی موشگافی کی پرزور مذمت کی اور دین و شریعت کے جملہ مظاہر کی اصل روح باطنی عشقِ الٰہی کو قرار دیا۔ اپنے مرشد کے اتباع میں جس نے نعرہ لگایا تھا کہ ؎

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما!   اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما! (۱۱)

انہوں نے بھی واشگاف الفاظ میں کہا ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات!

اور ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام   میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب!

اور فرمایا کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یا

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی   فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

اس لیے کہ جملہ اعمال کی روح عشقِ الٰہی ہے۔ اسی کی لپک بلالؓ کی اذان میں تھی اور اسی کی دمک تلقینِ غزالیؒ میں! بقول علامہ مرحوم: ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ   عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفٰےؐ!   عشق خدا کا رسُول، عشق خدا کا کلام!
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود   عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام!
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات!   عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات!

اور ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق!   معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق!

۲۔ نظامِ دین کی توضیح و تفسیر

نظامِ دینِ حق کی جو تشریح علامہ مرحوم کے کلام میں نظر آتی ہے اُسے بغرضِ تفہیم تین اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اور یہ تینوں درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے کی شرح اور ایک ہی "نقطۂ توحید" کی توسیع (Extension) کی حیثیت رکھتے ہیں:

ع   "یہ سب کیا ہیں، فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!"

(ا) مثلاً عام تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدتِ خالق ہی وہ اساسی تصوّر ہے جس سے وحدتِ انسانیت کا خیال جنم لیتا ہے اور جس میں مزید گہرائی و گیرائی وحدتِ آدم کے تصوّر سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجۃً انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے اصوُل مستنبط ہوتے ہیں، چنانچہ نظامِ دینِ حق کے اس پہلو پر بہت زور علامہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ میں اس وقت طوالت کے خوف سے ان دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

مردِ مومن کی شان میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں: ؎

کُلُّ مُؤمِنٍ اِخوَۃٌ اندر دِلش   حُرّیت سرمایۂ آب و گِلش   (۱۲)
ناشکیبِ امتیازات آمدہ   در نہادِ اُو مساوات آمدہ   (۱۳)

(ب) اسی طرح ہیئتِ سیاسی کے ضمن میں توحیدِ الٰہی ہی کے اصلُ الاصول سے مستنبط ہوتا ہے یہ اساسی قاعدہ کہ حاکمیت صرف خدا کے لیے ہے، ماسوٰی کی حاکمیت پر مبنی نظامِ سیاسی مجسّم شرک ہے۔

غور کیجیے کہ کتنے سادہ لیکن پُرشکوہ الفاظ میں ادا فرمایا ہے علامہ مرحوم نے یہ قاعدہ کلیہ: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے   حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

کسی ہیئتِ سیاسی میں تصوّرِ حاکمیّت کے بعد سب سے اہم مسئلہ "امرِ جامع" کا ہے یعنی یہ کہ اُس ہیئتِ سیاسی میں شریک افراد کو باہم ایک دوسرے سے جوڑنے والی چیز کون سی ہے! اس ضمن میں اس زمانے میں وطنی قومیّت کا جو تصور پوری دنیا میں رائج ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم نے اس کی شناعت کا احساس کس شدت سے کیا اور اس شجرِ خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا سنیے اور سر دُھنیے: ؎

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور   ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور   تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے   غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے   اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

(ج) یہی معاملہ نظامِ معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصُول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام مروجہ تصورات کی نفیِ کلّی ہے، اسی طرح ملکیتِ مطلقہ کے عام تصور کی بھی کامل نفی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر مُلک "اللہ" کا ہے تو "مِلک" بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس

سب کا ”مُلک“ (بادشاہ) اللہ ہے تو یقیناً ”مالک“ بھی اللہ ہی ہے۔

گویا انسان خود بھی اللہ کا ہے (اِنَّا لِلّٰہِ) اور جو کچھ اس کے پاس ہے، خواہ وہ اس کی اپنی ذات اور اس میں مخفی قوتیں، صلاحیتیں اور اس کی مہلتِ عمر ہوں، خواہ اس کا مال و اسباب یا زمین و جائیداد، سب اصلاً اللہ کی ملکیت ہیں اور اس کے پاس اللہ کی امانت، جس میں تصرف کا اختیار تو اسے دیا گیا ہے لیکن اصل مالک کے احکام کے اندر اندر۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں۔ بقول شیخ سعدیؒ: ؎

این امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خداست (۱۴)

افسوس کہ جب دینِ الٰہی کے چہرے پر ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام کی نقاب پڑ گئی تو اس کے روئے منور کے دوسرے خد و خال کی طرح یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور یہ علامہ مرحوم کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا شاہکار ہے کہ انہوں نے نکتۂ توحید کی اس لازمی توسیع (EXTENSION) کو بھی حد درجہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا: ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف   منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟   کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟   خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟   موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

نہ صرف یہ بلکہ مرحوم نے اس اصول کو بھی بہت وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا جو تاریخِ انسانی کے دوران پہلی بار خلافتِ راشدہ کے زمانے میں حضرت عمرؓ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا تھا، یعنی ریاست کی جانب سے تمام شہریوں کی کفالتِ عامہ۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس   نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس ! (۱۵)

اور ؎

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو' میں پوشیدہ ہے اب تک   اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !

اس سلسلے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں علامہ مرحوم کے یہ اشعار :

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ ! (۱۶)
ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو !   لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا (۱۷)
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن !   کس نداند لذتِ قرضِ حَسَن (۱۸)
از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ   آدمی درندہ بے دندان و چنگ (۱۹)
رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست   ایں 'متاعِ' بندہ و 'مِلکِ' خداست (۲۰)
بندۂ مومن امیں، حق مالک است   غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است (۲۱)
رأیتِ حق از ملوک آمد نگوں   قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں (۲۲)

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃ" (۲۳)

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (۲۴)
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ   ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ (۲۵)

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
سازِ قرآں را نواہا باقی است[1] (۲۶)

---

[1] اشارہ ہے اس حدیث نبویؐ کی طرف جس میں خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ باقی نہ رہے گا۔

(رواہ البیہقی عن علیؓ)

(۴)

اقبال اور قرآن

اب میں اس چوتھی اور آخری بات کے بارے میں کچھ عرض کر کے اپنی گزارشات ختم کردوں گا جس کے ضمن میں مَیں نے ابتدا میں یہ عرض کیا تھا کہ میرا گمان ہے کہ مجھے علامہ مرحوم کی روح سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے ـــــ یعنی مرحوم کا تعلق قرآنِ حکیم سے اس موضوع کا اہم ترین حصّہ تو پہلے ہی زیرِ بحث آچکا ہے یعنی یہ کہ علامہ مرحوم کی حیثیت فی الواقع "ترجمان القرآن" کی ہے، اور جیسا کہ خود اُن کا دعویٰ ہے ان کا فکر بھی قرآن ہی پر مبنی ہے اور ان کا پیغام بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے لہٰذا اب میں اس موضوع کے بعض ضمنی مگر نہایت اہم پہلوؤں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کراؤں گا

۱: عظمتِ قرآن کا نشان

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور میں علامہ مرحوم کی شخصیت عظمتِ قرآن کے ایک عظیم عَلَم اور نشان (SYMBOL) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عام آدمی کا متوارث عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے، اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق و اعتماد اور ایمان و یقین جو فکرِ انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم پھر چکا ہو اور مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو، بالکل دوسری بات ہے۔

سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل اور عظیم ترین معجزہ قرآنِ حکیم ہے۔ اب خود اعجازِ قرآنی کے پہلو بے شمار اور بے حد و نہایت ہیں جن کا احاطہ یا احصاء کسی فردِ بشر کے لیے ممکن نہیں۔ اور میرے نزدیک اس دَور میں اعجازِ قرآنی کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل عرب کے ایک اُمّی شخص (صلی اللہ علیہ وسلم وفداہ ابی وامی) نے پیش کیا تھا آج بھی جبکہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، مادی علوم انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم و ہنر کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے، نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے!

اور اسی کی ایک گواہی اور شہادت ملتی ہے علامہ مرحوم کی زندگی سے کہ ایک شخص جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں شعور کی آنکھ کھولی۔ پھر یہ نہیں کہ پوری زندگی "بسم اللہ کے گنبد" ہی

میں بسر کر دی ہو بلکہ وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا، مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھے، قدیم و جدید سب کا مطالعہ کیا —— لیکن بالآخر اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے، اور اس کی علم کی پیاس کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے، گویا بقول خود ان کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

کیا اس دَور میں قرآن حکیم کے "ھُدًی لِّلنَّاس" ہونے کے لیے کسی اور دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ اور کیا یہ کافی ثبوت نہیں ہے اس کا کہ قرآن ہر دَور اور ہر ذہنی سطح کے انسان کی فکری رہنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے؟

۲ : واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن

اور اسی کا ایک عکس سمجھیے اس حقیقت کو کہ اس دَور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف بھی جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا، شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو! اس لیے کہ عظمتِ قرآنی کا انکشاف بہر حال کسی شخص پر اس کے اپنے ظرفِ ذہنی کی وسعت اور عمق کی نسبت ہی سے ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ع "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" کے مصداق وہ فی الواقع جمال و جلالِ قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں، دید پر مبنی ہے، بلکہ ایسے لگتا ہے جیسے ان کا پورا وجود کلامِ پاک کی عظمت کے بارِ گراں سے "خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا" ہوا جا رہا ہے، عظمتِ قرآنی کا احساس و ادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور ان کا ہر بُنِ مُو قرآن کی جلالتِ قدر اور رفعتِ شان کے ترانے گا رہا ہے۔ ذرا گوشِ ہوش سے سنیے: ؎

آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم　　حکمتِ او لایزال است و قدیم (۲۷)
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات (۲۸)
حرف او را ریب نے، تبدیل نے　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے (۲۹)
نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃٌ لِّلعالمیں (۳۰)

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند[1]   از کتابے صاحبِ دفتر شدند (۳۱)
آنکہ دوشش کوہ بارش برنتافت   سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت (۳۲)

اور سوچیے کہ کیا اس کلام میں دُور دُور بھی کسی آورد کا سراغ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آمد ہی آمد ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ قائل کا قول نہیں، حال ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی اعلیٰ مثال ہے۔

اور اسی پہ بس نہیں، آگے بڑھیے اور سنیے:

؎ فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است (۳۳)
مثلِ حق پنہاں وہم پیداست ایں   زندہ و پائندہ و گویاست ایں (۳۴)
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست   عصرہا پیچیدہ در آنات اوست (۳۵)

بات کتنی سیدھی اور سادہ معلوم ہوتی ہے، قرآن عام معروف معنوں میں کتاب نہیں یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام خود متکلم کی صفت اور اس کی جملہ صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مثلِ ذاتِ باری تعالیٰ 'ظاہر' بھی ہے اور 'باطن' بھی اور 'زندہ' بھی ہے 'قائم و دائم' بھی۔ پھر نہ ذاتِ باری زمان و مکان کی مقید ہے نہ کلام الٰہی ان کا پابند، بلکہ جیسے خود اللہ تعالیٰ 'اول' بھی ہے اور 'آخر' بھی اور زمان و مکان کُل کے کُل وجودِ باری میں "گُم" ہیں، اسی طرح کلام الٰہی کے بھی "صیدِ زبوں" کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح اللہ کی شان یہ ہے کہ "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" اسی طرح قرآن حکیم بھی ہر دَور کے افق پر ایک خورشیدِ تازہ کے مانند طلوع ہوتا رہے گا! لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم میرے محدود علم اور مطالعے میں قرآن حکیم کی اس سے زیادہ مدح و ستائش ہماری پوری تاریخ میں موجود نہیں۔!

اب ظاہر ہے کہ تعریف معرفت کی مناسبت ہی سے کی جا سکتی ہے۔ بس اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ عظمتِ قرآنی کے کتنے بڑے 'عارف' تھے علامہ اقبال مرحوم!

اور یہیں سے سمجھ میں آ سکتی ہے یہ بات کہ کیوں اس قدر دُکھ تھا علامہ مرحوم کو اُمت کی قرآن مجید کی جانب عدمِ توجہ کی روش سے، جس کا مرثیہ ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے، اور کیوں ان کا

---

[1] جس کی سب سے تابندہ مثال حضرت ابوذر غفاری ہیں، رضی اللہ عنہ!

دلِ حسّاس خون کے آنسو روتا ہے اس پر کہ مسلمانوں کو، عام اس سے کہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، قرآن سے نہ اعتنا ہے نہ دلچسپی! غور فرمائیے کہ کتنی تلخی ہے علامہ کے اس شعر میں کہ:

بآیاتش ترا کارے جز این نیست!
کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری!! (۳۶)

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے علامہ مرحوم نے امتِ مسلمہ کے مختلف طبقات کا:

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست   از شرابِ نغمۂ قوال مست! (۳۷)
آتش از شعرِ عراقی در دِلش   در نمی سازد بقرآں محفلش (۳۸)
واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند   معنیٔ او پست و حرفِ اُو بلند (۳۹)
از خطیب و دیلمی گفتارِ او   با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو (۴۰)

رہے "فقیہانِ حرم" تو ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ:

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں   ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

لہٰذا اب عوام کا تو کہنا ہی کیا، وہ غریب تو ہیں ہی "کشتۂ ملائی و سلطانی و پیری"! ان کی عظیم اکثریت بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی، اور بقول علامہ مرحوم:

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب!   العجب، ثم العجب، ثم العجب! (۴۱)

اور ظاہر ہے کہ یہاں طلب سے مراد تعمیرِ خودی کی طلب بھی ہے اور غلبۂ حق کی آرزو بھی، اس لیے کہ فی زمانہ یہی دونوں نایاب ہیں اور انہی کا حال یہ ہے کہ:

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

رہی دنیوی آرزوؤں اور طولِ امل کا جال تو اس میں تو ہر شخص ہی ع "کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا" کے مصداق بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔

ملتِ اسلامی کے اس حالِ زبوں کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است   ملت اندر خاکِ اُو آسودہ است (۴۲)

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد یا مُسلماں مُرد یا قرآں بمرد! (۴۳)

۳: داعی اِلی القرآن

علامہ مرحوم کے نزدیک قرآن سے یہی دُوری اور کتابِ الٰہی سے یہی بُعد اصل سبب ہے مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور ملّتِ مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا! 'جوابِ شکوہ' میں جو بات انہوں نے صد درجہ سادہ الفاظ میں فرمائی تھی کہ:-

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

بعد میں اُس کا اعادہ نہایت پُرشکوہ الفاظ اور صد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا کہ:

خوار از مہجوریِ[1] قرآں شُدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی (۴۴)

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ (۴۵)

اور اب اُن کے نزدیک اسی "کتابِ زندہ" سے وابستہ ہے ان کا 'احیا' اور اسی پر دار و مدار ہے ان کی نشاۃِ ثانیہ کا! گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار ہے ان کے ازسرِ نو حقیقتاً مسلمان بننے پر اور ان کے مسلمان ہونے کا دار و مدار ہے قرآن حکیم پر ــــــ یا یوں کہہ لیں کہ ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ وابستہ ہے 'احیائے اسلام' سے اور احیائے اسلام وابستہ ہے 'احیائے قرآن' سے جو عبارت ہے مسلمانوں کے اس کے ساتھ صحیح تعلق کی ازسرِ نو استواری سے! علامہ فرماتے ہیں:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زندانِ تو! (۴۶)

قطع کردی امرِ خود را در زُبُر جادہ پیمائی اِلیٰ شیئٍ نُکُر (۴۷)

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن (۴۸)

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب (۴۹)

علامہ کے نزدیک علم ہے تو صرف علمِ قرآنی اور حکمت ہے تو صرف حکمتِ قرآنی اور یہی

---

[1] مہجوری کا لفظ استعمال کر کے علامہ قاری کے ذہن کو قرآن مجید کی اس آیت کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں:-
وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ۝ (الفرقان آیت ۳۰)

علم وحکمتِ قرآن ہے جو اگر کسی کے ذہن میں سرایت کر جاتے اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو منتج ہوتا ہے ظاہر کے انقلاب پر اور یہی وہ عمل ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے کہ :

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شُد، جہاں دیگر شود (۵۰)

اور کس خوبصورتی سے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ :

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ایں جہاں اندر بر اُو چوں قباست! (۵۱)
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش (۵۲)
یک جہانے عصرِ حاضر را بس است! گیر اگر در سینہ دل معنی رس است! (۵۳)

اور کہیں للکارتے اور غیرت دلاتے ہیں کہ :

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم؟ (۵۴)
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کُن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کُن! (۵۵)

علامہ کے نزدیک تطہیرِ ذہن اور تعمیرِ فکر کا واحد ذریعہ تو یہ ہے ہی کہ "اسرارِ دیں" فاش کیے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے "نکتہ ہائے شرعِ مبیں" کی وضاحت کی جائے، خود تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا کارگر اور مؤثر ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است (۵۶)
خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی (۵۷)

اور

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است (۵۸)
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل ندیدم جز بذکر (۵۹)

لیکن یہ ذکر صرف زبان سے ہی نہیں پورے وجود سے ہونا چاہیے :

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب (۶۰)

الغرض علامہ کے نزدیک اُمّت کے جملہ امراض کے لیے نسخۂ شفا بھی قرآن حکیم ہے اور ملّت کے تنِ مردہ میں ازسرِنو جان ڈالنے کے لیے آبِ حیات بھی چشمۂ قرآنی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات   در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات (۶۱)
می دہد مارا پیامِ لَا تَخَفْ   می رساند بر مقامِ لَا تَخَفْ (۶۲)
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام   شرحِ رمزِ صِبْغَةَ اللهِ گفتہ ام (۶۳)
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست   جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست (۶۴)

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام! (۶۵)

اور

از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است! (۶۶)
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حَبْلُ اللهِ اوست (۶۷)

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو!
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو! (۶۸)

گویا احیائے دین کی جدّوجہد ہو یا تجدیدِ ملّت کی سعی، علامہ مرحوم کے نزدیک اس کا مرکز و محور ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ ہے قرآنِ حکیم، اور یہی معنی ہیں قرآنِ حکیم کی اس آیت کے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ کار اور منہجِ انقلاب کی وضاحت کے ضمن میں معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مقامات پر وارد ہوئی ہے یعنی: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اور یہی ہے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کرنے کا وہ اصل کام[1] جس پر ایک طویل عرصے تک اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر میری نگاہ جم گئی ہے کہ "جا ایں جا است"!

---

[1] یہ دراصل نام ہے میرے ایک کتابچے کا جو میری اُس تحریر پر مشتمل ہے جو میں نے جون ۶۷ء میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آخر میں میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا اور ساتھ ہی آپ سب کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان گزارشات کو صبر اور سکون کے ساتھ سُنا۔ خود میں نے جو محنت اس سلسلے میں کی ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے بقاء و استحکام ملّتِ اسلامی کی تجدید و نشاۃِ ثانیہ اور دینِ حق کے احیاء و اظہار[1] ایسے اہم اور جلیل مقاصد کے ضمن میں علامہ اقبال کے فکر اور پیغام کی اشاعت کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی عوام میں بالعموم اور نوجوان نسل میں بالخصوص جو بُعد رفتہ رفتہ علامہ مرحوم کی شخصیت اور افکار و نظریات سے پیدا ہوتا جا رہا ہے، حالات کا ایک شدید تقاضا ہے کہ اسے کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ چاہیں تو اسے "احیائے اقبال" کا نام دے لیں۔ بہرحال یہ وقت کی ایک اہم ضرورت اور اسی کی ایک حقیر سی سعی ہے جو میں نے کلامِ اقبال سے یہ مواد جمع کر کے مرتب صورت میں آپ کے سامنے پیش کر کے کی ہے۔

اب اگر میری ان گزارشات سے آپ میں سے کسی ایک کے دل میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو جائے اور ایک عزمِ مصمّم پیدا ہو جائے کہ وہ قرآن ہاتھ میں لے کر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو، تب تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت پُوری طرح سپھل ہو گئی اور گویا "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!" اور اگر بدرجۂ ادنیٰ میری ان گزارشات سے آپ حضرات کے دلوں میں کلامِ اقبال کے مطالعے ہی کا شوق بیدار ہو جائے تب بھی میں یہ جانوں گا کہ میری محنت کم از کم ضائع نہ ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

'میثاق' کے صفحات میں لکھی تھی اور جو میری موجودہ سرگرمیوں کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ اس کے اب تک آٹھ ایڈیشن "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ برادرِ عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ نے کیا ہے، جسے مکتبۂ انجمن نے شائع کیا ہے۔ (اسرار احمد)

[1] هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ

(التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

اُردُو ترجمہ اشعارِ فارسی

(۱) ایک برہمن زادہ (یعنی علامہ اقبال خود) روم (مراد ہیں مولانا رومی) اور تبریز (مراد ہیں شمس تبریزی) کے علوم کا حامل اور ان کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔

(۲) و (۳) مثنویٔ مولویٔ معنوی یعنی مثنوی مولانا روم دراصل فارسی زبان میں قرآن ہی کی ترجمانی ہے اور میں ان (مولانا روم) کی صفات اس کے علاوہ اور کیا بیان کروں کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن انہیں کتاب بہرحال عطا ہوئی ہے۔

(۴) تا (۶) اگر میرے دل کی مثال اس آیئنے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو، اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور کی ترجمانی ہے تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرمادیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کردیں (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کردیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرمادیں!

(۷) تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہوجاتا ہے۔ (کاش کہ تو جان لے کہ) ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل سلگتے رہنا! (نہ کہ ایک بار بھڑک کر ختم ہوجانا!)

(۸) ہماری بقا سلگتے رہنے ہی میں ہے۔ اور ہم پر مچھلی کی طرح تڑپتے رہنے کے سوا ہر شے حرام ہے۔

(۹) جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا گل خشک و تر اس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔

(۱۰) خود کو درِ مصطفےٰ تک پہنچا کر دم لو۔ اس لیے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آسکے گا!

(۱۱) اے مرے جذبۂ عشق۔ اے میری عزیز متاع اور اے میرے جملہ امراض کے معالج، تو سدا شاد و آباد رہے!

(۱۲) و (۱۳) اس کے (یعنی بندۂ مومن) کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ "تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"! اسی طرح جذبۂ حریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے، وہ (نسلی، لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اُس کی سرشت میں موجود ہے!

(۱۴) یہ (میرا جملہ مال و اسبابِ دنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے، ورنہ ہر شے کا مالکِ حقیقی تو خدا ہی ہے!

(۱۵) شریعتِ حقّہ اور نظامِ اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

(۱۶) (جانتے ہو؟) قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سرو سامان لوگوں کا سہارا اور آسرا!

(۱۷) دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقّع نہ کرو۔ (اس لیے کہ قرآن نے صاف فرمادیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کرسکتے جب تک (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو!

(۱۸) سُود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سُود قرض دینے کی لذّت کسی کو معلوم نہیں!

(۱۹) سُود سے رُوح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔

(۲۰) زمین سے اپنے لیے رزق کا حصول جائز ہے۔ (لیکن) یہ انسان کے لیے صرف استعمال کی چیز ہے، ملکیت صرف خدا کی ہے۔

(۲۱) بندۂ مومن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے، مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہوجانے والا ہے!

(۲۲) حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہوجاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیاں کی بستیاں خوار و بدحال ہوجاتی ہیں۔

(۲۳) ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے۔ اس لیے کہ آدم کا پُورا خاندان ایک

جان کے مانند ہے۔

(۲۴) جب اس دنیا میں قرآنی تعلیمات کا سکہ چلا تو کہانت اور پاپائیت ایسے تمام گمراہ کن سلسلوں کا زور ٹوٹ گیا۔

(۲۵) مسلمانوں سے کہو کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!

(۲۶) (لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ) ہماری محفل ساقی اور شراب سے تہی دست رہ گئی ہے یعنی قرآن کے ساز کی صرف آواز ہی آواز باقی رہ گئی ہے!

(۲۷) وہ زندہ کتاب، قرآن حکیم، جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

(۲۸) زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ۔ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲۹) اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردو بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(۳۰) نوعِ انسانی کے لیے (خدا کا) آخری پیغام۔ جس کے لانے والے تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار پائے (صلی اللہ علیہ وسلم!)

(۳۱) اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آکر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس ایک کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے!

(۳۲) وہ (کتاب) کہ جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا!

(۳۳) (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں، حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

(۳۴) یہ ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(۳۵) اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار

زمانے موجود ہیں!

(۳۶) (لیکن افسوس کہ اے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!

(۳۷) ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے!

(۳۸) اس کے دل میں عراقیؔ کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(۳۹) (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے!

(۴۰) اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادیؒ سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمیؒ سے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!

(۴۱) کوئی صاحبِ قرآن ہو اور پھر بھی اس میں نہ جذبہ ہو نہ حوصلہ و امنگ، یہ کتنی تعجب خیز اور حیرت آمیز بات ہے!!

(۴۲) ہمارے سامنے ایک پرانا اور گھسا پٹا عالم ہے اور ملّتِ اسلامی اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔

(۴۳) (مسلمان اقوام مثلاً) مغلوں اور کُردوں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہو گئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہو گئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہو گئے ہیں!

(۴۴) (اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!

(۴۵) اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے!) اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتاب زندہ موجود ہے! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)

(۴۶) اے مسلمان! تیرا ایمان رسومات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر و مقید ہے!

(۴۷) تو نے اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے!

(۴۸) (اب) اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے!

(۴۹) اس کتاب کا حقِ تلاوت تم ادا کر دو۔ پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کر لو۔

(۵۰) (یہ کتابِ حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!

(۵۱) بندۂ مومن آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور اِس عالَم کی حیثیت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا۔

(۵۲) جب اس کے لباس کی کوئی قبا یعنی کوئی عالَم پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہانِ نو عطا فرما دیتا ہے۔

(۵۳) عصرِ حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہانِ نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو!)۔ اے مسلمان اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کر لے!

(۵۴) اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآنِ عظیم ہونے پر فخر ہے، آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے؟

(۵۵) (اُٹھو اور) دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعتِ اسلامی کے رموز و حِکم کی تشہیر و اشاعت کے لیے سرگرم ہو جاؤ۔

(۵۶) شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے، اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے!

(۵۷) بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت وہدایت) کی شمشیر سے گھائل کر کے
مسلمان بنا لیا جائے!

(۵۸) قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔

(۵۹) جانتے ہو یہ قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے
اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہو سکتا۔

(۶۰) (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق وشوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا
نام ہے۔ یہ محض زبان اور ہونٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور پوری ہستی کے ساتھ کرنے کا
کام ہے۔

(۶۱) (اے مسلمان) اگر دوام وثبات اور قوت واستحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دستِ
سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا سراغ ملا ہے!

(۶۲) یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا، بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں خوف
باقی رہتا ہے (نہ حزن!)

(۶۳) میں نے قرآن کے بحرِ بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور "صِبغَۃَ اللہِ" کے اسرار ورموز
کی شرح بیان کر دی ہے۔

(۶۴) میرے فکر کی یہ بلندی اور گردوں نوردی سراسر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے
طفیل میرے خیالات میں بحرِ بیکراں کی سی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

(۶۵) پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا لے یعنی میرے فکر اور پیغام
سے سرشار ہو کر آمادۂ عمل ہو جا تاکہ تو شمشیرِ برہنہ کے مانند چمکنے لگے!

(۶۶) وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ
باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

(۶۷) ہم تو سراپا خاک ہی ہیں، ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے

(۶۸) (اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ
اور پرو لے۔ ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور
منتشر (اور ذلیل وخوار) رہ!

* * *

ع بیا بہ مجلسِ اقبالؔ و یک دو ساغر کش!

فکرِ اقبال

کی روشنی میں

حالاتِ حاضرہ

اور

ہماری قومی ذمہ داریاں

خطاب بہ مجلسِ اقبال

الحمرا آڈیٹوریم ——— ۲۱ اپریل ۸۶ء

از

اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

احمدہٗ و اصلّی علیٰ رسولہ الکریم

امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب اشرح لی صدری ○ ویسّر لی امری ○ واحلل عقدۃ من لسانی ○

یفقھوا قولی ○

محترم و مکرّم صدرِ مجلس!

محترم اراکین و کارکنان مرکزیہ مجلسِ اقبالؔ لاہور،

اور معزز خواتین و حضرات!

اگرچہ اس سے قبل بھی متعدد بار ؏ "بیا بہ مجلسِ اقبالؔ و یک دو ساغر کش" کے مصداق مجلسِ اقبالؔ میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل ہو چکی ہے لیکن اس بار جس انداز میں اس بندۂ ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا گیا ہے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ واقعۃً میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا مجبوراً ملک نصراللہ خاں عزیزؔ مرحوم کے الفاظ مستعار لے رہا ہوں کہ ؏ "اِک بندۂ عاصی کی —— اور اتنی مداراتیں ——!"

مجھے آج صبح ہی کی فلائٹ سے 'شامِ الہدیٰ' کے مستقل پروگرام کے لیے کراچی روانہ ہو جانا تھا لیکن مجلسِ اقبالؔ میں شرکت کی سعادت کے لیے یہ ادنیٰ سا تردّد تو ہرگز کوئی قربانی نہیں کہ یہاں سے سیدھا ایئر پورٹ اور ایئر پورٹ سے سیدھا تاج محل ہوٹل کراچی پہنچوں —— البتہ منتظمین مجلس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا کہ انہوں نے خاص طور

پر میری شمولیت کے لیے مجلس کا آغاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ پہلے کیا۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا احساس بھی شدت سے ہے کہ آج سے ڈیڑھ سال قبل کی ایک مجلس کی طرح آج بھی مجھے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی آدابِ مجلس کے خلاف فوراً روانہ ہوجانا ہوگا اور اس طرح میں اپنے سے بدرجہا اعلم و افضل اصحابِ علم و فضل کے افکار و خیالات سے مستفید نہ ہوسکوں گا۔ بہرحال "مالا یُدرکُ کلّہٗ لا یُترکُ کلّہٗ" کے مصداق جو میسّر آگیا ہے غنیمت ہے!

بہت سے حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ 'میں اپنی روایت کے یکسر خلاف' آج اپنے خیالات تحریری صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اس بار 'مجلس اقبال' کے لیے بھی ایک موضوع تجویز کر دیا گیا ہے یعنی "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمّہ داریاں" اور یہ موضوع اوّلاً تو خطیبانہ جوش سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے ــــــ ثانیاً اس کا اندیشہ ہے کہ زبانی گفتگو کی روا روی میں اس کا کوئی اہم گوشہ تشنہ رہ جائے! ــــــ پھر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ باتیں جلد از جلد وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور من و عن شائع ہوں لہٰذا "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ" کے مطابق ذہن و لسان کے مابین قلم کو خیالات کی شیرازہ بندی کے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

عنوان میں اختیار کردہ ترتیب سے ذرا سا ہٹ کر میں پہلے "حالاتِ حاضرہ" کے ضمن میں اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے معمارِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے اس اندیشے کے عین مطابق جو اُن کے اس تاریخی جملے میں سامنے آتا ہے کہ:-

> "God has given us a golden opportunity to prove our worth as architects of a new nation and let it not be said that we did'nt prove equal to the task".

اپنی نااہلی اور عدم قابلیّت کا بھرپُور ثبوت دیتے ہوئے اُن کے قائم کردہ پاکستان کو تو آج سے لگ بھگ ساڑھے چودہ سال قبل دولخت کرالیا تھا ـــــــ اب اندیشہ یہ ہے کہ مفکرِ و مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں جس پاکستان کا خواب

> "An independent Muslim State at least in the North-West of India".

کی صُورت میں دیکھا تھا کہیں ہم اُسے بھی اپنی نااہلیوں کی بھینٹ نہ چڑھا دیں! اور اس طرح برِّصغیر پاک و ہند کی مسلم قوم کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی مساعی حبطِ اعمال کے حسرتناک انجام سے دوچار نہ ہو جائیں! ـــــــ اس لیے کہ ایک طرف ع "خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری!" کے مصداق تا حال 'بے آئینی' ہی سرزمین پاکستان کا 'آئین' ہے گویا قمری حساب سے اپنی قومی زندگی کے چالیس سال پُورے کرچکنے کے باوجود (واضح رہے کہ آنے والے ماہِ رمضان مبارک کی ستائیسویں کو یہ چالیس سال پُورے ہو جائیں گے!) ہم ؎

"چہل سالِ عمرِ عزیزت گذشت　　مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت"

کے مصداق سیاسی و دستوری اعتبار سے ہنوز 'نابالغ' ہیں! ـــــــ تو دوسری طرف ـــــــ صاف نظر آتا ہے کہ ع "آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف" ـــــــ اور

؎ "چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں!"

کے مصداق اس قافلۂ ملّی کی کوئی منزلِ معیّن ہے ہی نہیں! اور "یہ ہجومِ مومنیں" "بے مقصدیت" کے صحرائے تیہ میں بالکل اس شان سے بھٹک رہا ہے کہ

؎ کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں　　اے ہجومِ نا اُمیدی دل بہت گھبراتا ہے!

چنانچہ اغیار طعنے دے رہے ہیں اور پھبتیاں چُست کر رہے ہیں، مبصّرین اور تجزیہ نگار انتشار (DISINTEGRATION) اور حصّے بخرے ہو جانے

(BALKANISATION) کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں اور دشمن گھات میں ہیں کہ کب آخری ضرب لگانے کا بہترین موقع ہاتھ آئے اور ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم کر دیا جائے۔!

گویا، نظر بظاہر، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز   جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

پاکستان کی فضا پر متذکرہ بالا عمومی تشویش اور بددلی و مایوسی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کے درمیان سے جھانک کر واقعات کی دنیا میں "حالاتِ حاضرہ" کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

ایک جانب سیاچین گلیشیر ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے، اور کشمیر کی کنٹرول لائن آئے دن کی بھارتی جارحیت سے خون آلود ہوتی رہتی ہے۔ پھر کشمیر کے علاوہ ہماری حساس ترین سرحد سے ملحق بھارتی پنجاب شدید خلفشار اور عدم استحکام کا شکار ہے اور اس کے ضمن میں کوئی دن نہیں جاتا جب بھارتی زعما میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہراتا ہو۔ نتیجۃً پاکستان سے بھارت کی پیدائشی دشمنی اور مستقل نفسیاتی اور واقعاتی آویزش پر مستزاد یہ فوری اور شدید اندیشہ سر پر منڈلا رہا ہے کہ کسی بھی وقت اپنے اندرونی خلفشار کے باعث جھنجھلا کر بھارت کسی بڑی جارحیت کا ارتکاب نہ کر گذرے!

دوسری جانب افغانستان کی صورتِ حال اور اس کے داخلی نظریاتی تصادم پر مستزاد روس کی ننگی اور براہِ راست مداخلت اور امریکہ کی قدرے ڈھکی چھپی اور بالواسطہ دخل اندازی نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لیے شدید مسائل اور خطرات پیدا کر رکھے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان، افغانستان اور روسی ترکستان کے پورے علاقے کی قسمت کو گویا ایک معلّق ترازو سے وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ جہاں اس کی بھی امید ہے کہ ایک مردِ درویش کے لگ بھگ

پوَن صدی قبل کے الفاظ کہ ؎

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دِلوں کو   لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

حقیقت و واقعیت کا رُوپ دھار لیں اور یہ خطّہ ایک وحدت کی صُورت اختیار کر کے اسلام کی نشاَۃِ ثانیہ اور عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بن جاتے، وہاں یہ خطرہ بھی حقیقی اور واقعی ہے کہ سائبیریا کا برفانی ریچھ بحیرۂ عرب کے گرم پانی میں غوطہ لگانے کے لیے آخری دَوڑ کا آغاز کر دے اور ُ خاکم بدہن ٗ پاکستان بھی اُس کی عریاں جارحیت کا نشانہ بن جائے!

داخلی محاذ پر ——— پاکستان کی ماں اور معمارِ پاکستان اور مصوّر و مفکرِّ پاکستان دونوں کی مشترک وراثت مسلم لیگ جوان دونوں کے منظرِ عام پر آنے سے قبل واقعۃً صرف نوابوں اور نواب زادوں، اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی البتّہ ۳۵ء اور ۴۷ء کے درمیان ایک عوامی تحریک کی صُورت اختیار کر گئی تھی عرصہ ہوا کہ ع "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" کی مصداقِ کامل بن چکی ہے۔ اور حال ہی میں سرکاری و درباری ذرائع سے اُس کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش ہوئی ہے اور غیر جماعتی انتخابات میں اپنے ذاتی وسائل اور محض زمینداری یا سرمایہ داری کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی پیشانی پر اس کا لیبل چسپاں کر کے اس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی جو کوشش کی گئی ہے کون نہیں جانتا کہ اُس کا حاصل کچھ نہیں اور کم از کم عوام کی سطح پر اُس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حیثیّت۔

اس طرح 'بظاہر موجود لیکن حقیقتاً کالعدم مسلم لیگ' سے قطع نظر ——— قومی سیاست کے میدان میں انتہائی بائیں جانب ہیں وہ اشخاص اور گروہ جن کی پاکستان کو توڑ دینے کی خواہش اب ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ ببانگِ دہل سامنے آ چکی ہے۔ ان میں شخصیات کی سطح پر تو اہم نام صرف خان عبدالغفار خاں اور جی ایم سیّد کے ہیں البتّہ چھوٹی بڑی جماعتیں یا گروہ نصف درجن بلکہ اس سے بھی زائد ہیں جن میں اہم تر نام این ڈی پی، پی این پی، اور سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ کے ہیں! ——— تاہم غنیمت ہے کہ ابھی ان سب کا دائرۂ اثر

صرف چھوٹے صوبوں تک محدود ہے اور پنجاب کی حد تک اس کی صرف ایک خفیف سی صدائے بازگشت جناب حنیف رامے کی صورت میں سامنے آئی ہے!

دوسری انتہا پر ہیں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں، جن کی اکثریت واضح طور پر دائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں بھی قابلِ ذکر تو تین ہی ہیں یعنی جے یو آئی، جے یو پی اور جماعتِ اسلامی تاہم دوسری نسبتاً چھوٹی جماعتوں اور بڑی جماعتوں کے متحارب دھڑوں کو بھی شمار کیا جائے تو تقریباً وہی بائیں بازو والی تعداد بن جاتی ہے —— یہ جماعتیں اگرچہ پاکستان کے بقا و استحکام کی بھی دل سے خواہش مند ہیں اور اس میں اسلام کے نفاذ کی بھی داعی ہیں لیکن اولاً اس بنا پر کہ ان کا دائرۂ اثر بہت محدود بھی ہے اور ملک کے طول و عرض میں مختصر ٹکڑوں (SMALL POCKETS) کی صورت میں منتشر بھی، اور ثانیاً اس بنا پر کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی محبت اور وفاداری کی عظیم قدرِ مشترک کے باوجود اُن کی باہمی آویزش بلکہ چپقلش ضربُ المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے، وہ کوئی فیصلہ کُن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نظر نہیں آتیں!

ان دو انتہاؤں کے مابین واقعہ یہ ہے کہ قومی اور عوامی سیاست کا اصل دھارا سیکولر ڈیماکریسی یا سوشل ڈیماکریسی کے رُخ پر بہہ رہا ہے جس میں یُوں تو جماعتی اور تنظیمی سطح پر دو نام سامنے آتے ہیں یعنی ایک پاکستان پیپلز پارٹی کا اور دوسرا تحریکِ استقلال کا —— لیکن بنظرِ غائر دیکھا جاتے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ عظیم دھارا اصلاً کچھ چھوٹی اور بڑی، اور نئی اور پرانی شخصیتوں اور ان کے مدّاحوں اور حامیوں، اور عاشقوں اور جان نثاروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور سرِ دست یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم لہر پر سواری کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے —— گویا

دیکھیے! اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا   گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اسی درمیانی دھارے میں ایک طوفانی لہر حال ہی میں آنسہ بے نظیر بھٹو کی اپنی اختیاری جلاوطنی کو ختم کر کے پاکستان واپسی —— اور شہرِ اقبال لاہور میں ورود ——

اور اس موقع پر ان کے بے مثال اور حد درجہ والہانہ استقبال، اور پھر پاکستان کے دل پنجاب، اور اس کے بھی اصل قلب یعنی لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد وغیرہ کے اضلاع میں ان کے شاندار اور والہانہ خیر مقدم اور عظیم الشان جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں اُٹھی ہے جس نے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے کسی بھی درجے میں بہرہ ور ہر پاکستانی مسلمان کو نہ صرف یہ کہ ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے بلکہ ملک و ملت کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور غالباً یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے کہ مجلس اقبال بھی جو ایک خالص روایتی اور ثقافتی ادارہ بن چکی تھی "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریوں" کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

ہماری قومی اور عوامی سیاست کے اصل اور عظیم تر درمیانی دھارے میں جو طوفانی لہر حال ہی میں اُٹھی ہے اُس کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ یہ کسی حد تک آٹھ نو سال کے سیاسی حبس کا ردِ عمل ہے اور اس بات میں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے کہ حالیہ طوفانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی، گویا ع "چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی!" — لیکن اس قسم کے جملہ عوامل کا حصہ منہا کرنے کے بعد بھی اس کیفیت (PHENOMENON) کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے کہ اس کے اصل عوامل کیا ہیں، اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے ضمن میں ملک و ملت کے مخلصوں اور بہی خواہوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے —— اس لیے کہ جہاں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس طوفانی لہر کے جوش کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس پر سوار قائدین بے قابو ہو جائیں اور جھنجلاہٹ میں کوئی غلط اقدام کر بیٹھیں، وہاں اس کے سرکاری یا غیر سرکاری مخالفین کا غلط طرزِ عمل اور MIS-HANDLING بھی نہایت خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے — جس کا ایک تجربہ ہم پندرہ سال قبل مشرقی پاکستان کے معاملے میں کر چکے ہیں!

میں جب علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں عوامی سیاست کے اس درمیانی دھارے اور اس کی موجودہ طوفانی لہر کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے بعینہٖ وہی صورت نظر آتی ہے جو حضرتِ علامہ نے اُس تہذیبِ حاضر کے تجزیے کے ضمن میں پیش فرمائی ہے جو اپنے آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً مغربی اور یورپی تھی لیکن اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی اور آفاقی بن گئی تھی اور اس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے —— اور جس کی خودکشی کی خبر بھی علامہ مرحوم نے اب سے لگ بھگ پون صدی قبل دی تھی کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی　　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کے نزدیک اس تہذیب کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں؛ ایک اس کی اصل ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی صلابت اس کے قیام و بقا کی اصل اساس ہے، 'خطبات' میں حضرت علامہ نے اسے 'INNER CORE' سے تعبیر فرمایا ہے —— اور اسے خالص قرآنی الاصل گویا صد فی صد اسلامی قرار دیا ہے۔ یعنی الفاظِ قرآنی: "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝" (بنی اسرائیل: ۳۶) کے مطابق یہ طرز اور روش کہ اپنے موقف کی بنیاد نہ توہمات پر قائم کی جائے نہ نرے ہوائی تخیلات پر بلکہ مشاہدات و تجربات اور ان پر مبنی ٹھوس استدلال پر قائم کی جائے۔ حضرتِ علامہ کی یہ رائے نہایت صائب اور حد درجہ اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہی قرآنی ہدایت و رہنمائی تھی جس نے ایک جانب مظاہرِ قدرت کو آیاتِ الٰہیہ کا تقدس عطا فرمایا[1] اور انسان کو کتابِ فطرت کے سائنٹیفک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا[2] اور دوسری جانب منطق کو استخراج کی تنگنائیوں سے نکال کر

---

[1] سورۃ البقرۃ: آیت ۱۶۴　　[2] سورۃ الغاشیہ آیات: ۱۷ تا ۲۰

استقراء کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا ——— اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے میدان ہموار کیا۔ چنانچہ یہی چیز یورپ میں تحریکِ احیاءِ علوم کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اوجِ ثریا پر پہنچیں اور یہ صورت پیدا ہوئی کہ:؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

حضرت علامہ کی یہ ژرف نگاہی بجائے خود جس عظمت کی مظہر ہے اُس سے قطع نظر میرے لیے اس کی قدر و قیمت کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اہم قول کی عظمت و صداقت مبرہن ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ "انّ اللہ یرفع بھذا الکتٰب اقواماً ویضع بہٖ اٰخرین: " اب اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو ابھارے گا اور اسی کے (ترک کرنے کے) باعث قوموں کو گرائے گا!" گویا مغربی تہذیب بھی جو اُبھری تو یقیناً قرآن ہی کی ہدایت و رہنمائی کے ایک اہم جزو کے سہارے اُبھری! اور مسلمان گرے تو اسی سبب سے گرے کہ انہوں نے قرآن کی اس ہدایت سے یورپ کو روشناس کرانے کے بعد خود اُسے ترک کر دیا گویا؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر   اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ   در بغل داری کتابِ زندۂ

۲۔ تہذیبِ حاضر کا دوسرا جزو اُس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں جنہیں خطبات میں تو حضرت علامہ نے صرف ایک لفظ 'DAZZLING EXTERIOR' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن اشعارِ اقبال کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مظاہرِ خارجی کے بھی دو رُخ ہیں جنہیں کہیں تو حضرت علامہ 'چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر' کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں، کہیں ان کی نشاندہی ع 'طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری' جیسے الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں ——— اور اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ بھرپور انداز یہ ہے کہ:؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی   یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تہذیبِ حاضر کے ان بظاہر حسین و خوشنما اور دل کش و مرعوب کُن مظاہر خارجی میں سے مثلاً ایک[۱] حریتِ فکر ہے جس کے پردے میں یا باضابطہ کفر و الحاد ہے یا لاادریت وارتیابیت' اور ان دونوں کا حاصل ہے یا عریاں لامذہبیّت یا کم از کم محدود مذہبیت کے پردے میں لپٹی ہوئی لادینیت! ـــــ گویا ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار   انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

دوسرے[۲] حریتِ عمل ہے جس کی شکرّ والی تہہ کے نیچے مضمر ہے اباحیت اور آوارگی کا زہر، جس نے اخلاق و کردار اور شرافت و انسانیت کا دیوالہ نکال دیا ہے، تیسرے[۳] نمبر پر ہے حریتِ نسواں اور نظریۂ مساواتِ مرد و زن جس نے مرد کو 'نامرد' اور زن کو 'نازن' بنا کر رکھ دیا اور دونوں کو تماشائی و ہرجائی بنا کر خاندان کے مقدّس ادارے کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور   کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

اور   کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟   مرد بے کار و زن تہی آغوش!

اسی طرح ؎ ”خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج!“

کے مصداق اجتماعیاتِ انسانیہ کے ضمن میں تہذیبِ مغرب نے سیاسی و معاشی مساوات کے حسین عنوانوں سے انسان کو اوّلاً لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کا تحفہ دیا جو ”چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر“ کا مصداقِ کامل ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے حقیقتاً سرمایہ داروں کی بدترین آمریت عوام پر مسلط ہو گئی ؎

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اور اس کے بعد، اس نہلے پر دہلا بے خدا اشتراکیت کا مارا جس نے انسان سے اُس کی آزادی کو کُلّیۃً سلب کر کے اُسے ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ فاعتبروا

آگے بڑھنے سے قبل، اس مقام پر دو امور کی وضاحت مناسب ہے:

ایک یہ کہ تہذیبِ جدید کے اس المیے کا اصل سبب سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کی روشنی میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے "عِلْمُ الْاَسْمَاءِ" پر تو پوری توجّہ صرف کی جو ابتدائے آفرینش ہی میں حضرت آدم کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور جس نے تاریخِ انسانی کے دَوران مسلسل بروز و ظہور اور صعود و ارتقاء کے ذریعے 'علم الاشیاء' اور 'علم الخواص' کے راستے سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کی ——— لیکن اُس علمِ وحی سے یکسر منہ موڑ لیا جسے قرآن 'ہدایت' (فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ)[1] سے تعبیر کرتا ہے۔ نتیجۃً اُس نے اُس 'دجّال' کی صورت اختیار کر لی جس کی ایک آنکھ بند ہے اور جس کی پیشانی پر جلی حروف میں "ک ف ر" لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اب یہ یک چشم عفریت نوعِ انسانی ہی نہیں ہر قسم کی حیاتِ ارضی کی کلّی تباہی پر تُلا کھڑا ہے!

دوسرے یہ کہ عالمِ اسلام میں اس تہذیب کے ضمن میں یہ متوازن نقطۂ نظر میری محدود معلومات کی حد تک، سوائے علامہ اقبال مرحوم کے اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتا، اور اُن کے بعد اُن کی شمع سے اپنے چراغ روشن کرنے والوں میں بھی کم از کم اپنی محدود بصارت و بصیرت کی حد تک مجھے صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس کے فکر میں اس توازن کا عکس کامل موجود ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم و مغفور! ——— ورنہ اکثر و بیشتر افراد و اشخاص کی حد تک بھی یا حیرانی و سرگردانی نظر آتی ہے، یا انتہا پسندی اور یک رُخا پن! ——— اور بحیثیتِ مجموعی بھی ملّت کے دو اہم طبقات نے متضاد طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طرف علماء کرام کی اکثریت نے اس تہذیب کو بالکلیہ رَد کر دیا۔ نتیجۃً اس کے اُس INNER CORE سے بھی محرومی اختیار کر لی جو اصلاً خالص قرآنی اور اسلامی تھا۔ اور وہ صرف

---

[1] البقرۃ: ۳۸

آسمانی ہدایت کے امین بن کر قال اللّٰہؐ اور قال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اور دوسری جانب قوم کی عظیم اکثریت نے تہذیبِ مغرب کو من و عن قبول کر لیا نتیجۃً اس کے 'INNER CORE' کے ساتھ ساتھ اس کی "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" سے پیدا شدہ "صنّاعی" کو بھی ایک شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ساتھ جُوں کا تُوں قبول کر لیا، نتیجہ وہ نکلا جسے کسی صاحبِ درد نے یوں بیان کیا کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر — تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض — اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

اور اس ضمن میں بھی اللہ رحمتیں نازل فرمائے اپنے اُس بندۂ قلندر پر جس نے کمالِ انصاف کا ثبوت دیا جب ملّت کے ان دو اہم طبقات کے تضادِ عمل کو یُوں واضح کیا کہ ؎

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے — تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

فکرِ اقبالؔ کی اس روشنی میں پاکستان کی عوامی سیاست کے بڑے اور درمیانی دھارے اور اُس کی حالیہ 'مہیب' لہر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بھی دو جزو سامنے آتے ہیں چنانچہ اس کا بھی ایک 'INNER CORE' ہے جو نہ غیر اسلامی ہے نہ غیر قرآنی، اور نہ افکار و نظریاتِ اقبال کے منافی ہے، نہ تصوّراتِ قائدِ اعظم کی نقیض بلکہ عین قرآنی اور اسلامی بھی ہے اور پاکستان کے مصوّر و مفکّر اور مؤسّس و معمار دونوں کے خیالات کے مطابق بھی اور اسی میں اس دھارے کی مقبولیت اور اس کی قوّت و شوکت کا راز مضمر ہے، البتّہ دوسرا جزو جو بجائے خود نہایت اہم ہے بے خدا بھی ہے اور بے دین بھی اور خالص مُشرکانہ بھی ہے اور ملحدانہ بھی! اور یہ بات نہایت اہم اور لازمی ہے کہ ان دونوں اجزا کو علیحدہ علیحدہ پہچان لیا جائے اور دونوں کے ساتھ ایک طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے علیحدہ علیحدہ رویّہ اختیار کیا جائے!

اس دھارے اور لہر کی 'INNER CORE' کے اجزاءِ ترکیبی میں سے اوّلین

جزو ہے"۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ . . . الآیۃ" کے مطابق انسان کا محض انسان ہونے کے ناطے اعزاز و اکرام اور تشریف و تکریم، اور رنگ و نسل، مال و منال، اور عہدے، پیشے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں کے مابین اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و رذیل، اور اونچ اور نیچ کے جملہ امتیازات کا مکمل خاتمہ اور انسانوں کے مابین اس سماجی و معاشرتی سطح پر کامل مساوات! بفحوائے الفاظ قرآنی: "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ" (الحجرات ۱۳) اور بقول اقبال

کُلُّ مومن اخوۃٌ، اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ! در نہادِ اُو مساوات آمدہ!

ان امتیازات کا کلی خاتمہ اور کامل انسانی مساوات کا بالفعل قیام رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طُرّۂ امتیاز ہے جس کے سامنے ایچ جی ویلز جیسے دشمنِ اسلام اور شاتمِ رسولؐ بھی اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ چیز ہے جو موجودہ نام نہاد مسلمان معاشرے میں ناپید ہو چکی ہے، اس ضمن میں علامہ اقبال نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ ؎ "یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو، ۔ تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!" ——— میں اُن کی رُوح سے معذرت کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ ؏ "تم سبھی کچھ ہو مگر سوچو کہ 'انسان' بھی ہو!"

اس 'INNER CORE' کا دوسرا اہم جزو ہے انسان کے بنیادی عمرانی حقوق (یعنی ——— CIVIL RIGHTS) اور ان کے ضمن میں کامل سیاسی و قانونی مساوات! جس سے "تمیزِ بندہ و آقا" کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور نہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حکمران ہو، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقے پر برتری کا حامل ہو اور نہ ہی کوئی علاقہ دوسرے علاقے پر بالادستی کا حق جتائے، بلکہ نوعِ انسانی "کونوا عباد اللہ اخوانا" (الحدیث) پر عمل پیرا ہو جائے۔ (ترجمہ) تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ! ——— حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتِ اقدس اور جسمِ اطہر کو بھی قصاص کے لیے پیش فرما کر حضرت

عمرؓ نے بھرے مجمع میں احتساب پر برافروختہ نہ ہو کر بلکہ بالفعل جوابدہی فرما کر، اور حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں عدالت میں ایک عام مدّعی کی حیثیت سے پیش ہو کر اور اپنے دعوے کے اخراج پر کبیدہ خاطر نہ ہو کر جو اعلیٰ و روشن اور ابدی و لازوال مثالیں قائم کی تھیں وہ آج متّفق علیہ اقدار کی حیثیت سے انسان کے اجتماعی ضمیر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور عہد حاضر کا انسان ان کو ACHIEVE اور REALISE کرنے کے لیے علامہ اقبال کے ان پرشکوہ الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو — زانکہ از خاکش بروید آرزُو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

لیکن چونکہ وہ نُورِ نبوّت سے براہِ راست استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا افراط و تفریط کے دھکوں کے سوا سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا —— تاہم کون نہیں جانتا کہ آج اِن اقدارِ عالیہ سے سب سے بڑھ کر محروم اور سب سے زیادہ تہی دست و تہی دامن وہ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں —— اور اِسی کا ردِ عمل ہے جو ہماری سیاست کے موجودہ ابھار کی اساس بنا ہے!

اس 'INNER CORE' کا تیسرا لیکن اہم ترین جزو ہے معاشی عدل و انصاف اور کم از کم مواقع کی حد تک کامل مساوات اور ہر نوع کے اقتصادی استحصال اور 'سرمایہ داری' کی لعنت کا مکمل خاتمہ اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمہ! —— یہ تمام باتیں وہ ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنے کلامِ پاک میں ارشاد فرمائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے حواریین و خلفاءِ راشدین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے بالفعل کر کے دکھائیں چنانچہ "كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ" کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے اور "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا" کے مطابق حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ: اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا

بھی بھوکا مرجائے تو اس کے لیے اللہ کے یہاں عمرؓ ذمہ دار ہوگا!" اسلام کے اقتصادی مقاصد کے ضمن میں POLICY STATEMENT کی حیثیت رکھتا ہے جسے اقبالؔ نے یوں تعبیر فرمایا کہ:

؎ کس نباشد در جہاں محتاج کس   نقطۂ شرعِ مبین این است و بس

اور آب و نانِ ماست از یک مائدہ   دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

لیکن افسوس کہ جب مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس پر ملوکیت کے ساتھ ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رُخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں وہ صورت بن گئی جس کا نقشہ حضرت علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

نتیجۃً ——— قوم کی عظیم اکثریت تو اقبال کے اس شعر کا مصداقِ کامل بن ہی چکی ہے کہ ؎

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو   لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا

خود مذہبیت کی بھی اکثر و بیشتر صرف یہ مسخ شدہ صورت (PERVERTED FORM) باقی رہ گئی ہے کہ ہر قسم کے حرام و حلال ذرائع سے دولت سمیٹو البتہ کچھ صدقہ و خیرات کے کھاتے بھی جاری رکھو۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سُود دے کر اُس میں سے زکوٰۃ وصول کر لینے کا تماشا تو حال ہی میں ہُوا ہے۔ 'سُود لو اور اُس میں سے زکوٰۃ دے دو' پر تو ہمارے مذہبی مزاج کے سرمایہ دار بزرگ بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں۔

اِس سلسلے میں نقد کے ضمن میں 'رِبا النسیئہ' اور 'ربا الفضل' کی جو بے شمار صورتیں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر ہماری پوری تجارت و صنعت اور ریاست کی سطح پر دفاع و ترقی کی جملہ سکیموں میں رچی بسی ہوئی ہیں اُن کا ذکر تو تحصیلِ حاصل ہے' اگرچہ حضرتِ علامہ کے یہ دو اشعار نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ؎

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!   کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ، دِل چوں خشت و سنگ　　آدمی درندہ بے دندان و چنگ

تاہم زمین کے "سود" کا ذکر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اُس کے ضمن میں مذہبی سطح پر تو مغالطے موجود ہیں ہی شیدائیانِ اقبال کا ذہن بھی صاف نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ان اشعار کو تو لہک لہک کر پڑھتے ہیں کہ:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا، فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور۔ دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں　　تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

اور۔ رزق خود را از زمیں بردن روا ست　　ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا است!

لیکن غالباً انہوں نے قرآن کی اس تعلیم اور اقبال کی اس تبیین کو صرف اخلاقی وعظ کے خانے میں رکھا ہوا ہے، اور یہ نہیں جانتے کہ زمین کے سلسلے میں یہ اسلام کے قانونی و فقہی نظام کی اہم اساس ہے! چنانچہ امامِ اعظم ابو حنیفہؒ اور امام دار الہجرت مالکؒ دونوں کا متفقہ فتویٰ ہے کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے اور اقبال کا یہ فرمانا محض شاعری[1] نہیں ہے کہ

خدا آں ملتے را سروری داد　　کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت

بہ آں قومے سروکارے ندارد　　کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

چنانچہ سماجی، سیاسی اور معاشی جملہ سطحوں پر تمام ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کر کے دینِ حق کے کامل نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ و قائم کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے خاتم النبیّین اور سیّد المرسلین، محمد الامین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ـــــ (بفحوائے الفاظِ قرآنی "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ" (الشوریٰ: ۱۵) اور "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (الحدید: ۲۵) اور ع "خدایا آں کرم بارِ دگر کُن"! کے مصداق

---

[1] ع "مرا یاراں غزلخوانے شمردند"

اسی کا پیغام دیا تھا حکیم الامت اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

چنانچہ اقبالؔ سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں شعریت اور جذباتی سوز و ساز کے اعتبار سے کلامِ اقبال کے نقطۂ عروج کا مظہر اُن کی دوسری نظمیں خصوصاً ذوق و شوق ہیں وہاں اُمتِ مسلمہ کے نام اُن کے پیغام کا مظہرِ اتم و اکمل ہے 'ابلیس کی مجلس شوریٰ'، اور خصوصاً اُس کے یہ آخری اشعار: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!
الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

چنانچہ اُس مردِ قلندر نے تو نہ صرف یہ کہ ع "جوہرِ دریائے قرآں سُفتہ ام" کے مصداق قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کی دل نشیں پیرائے اور شعری اسلوب میں تعبیر و تعلیم میں اپنی توانائیاں کھپا دیں بلکہ ساتھ ہی 'انقلاب' کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ــــ کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے نام لیواؤں اور شیدائیوں نے اُن کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ ؎

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من　　وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من

مزید برآں ــــ یہی تھی وہ حقیقت جسے تعبیر فرمایا تھا بابائے قوم اور بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کبھی ان الفاظ سے کہ "ہم پاکستان کی صورت میں ایک ایسے خطۂ ارضی کے خواہاں ہیں جس میں اسلام کے اصولِ حُریّت و اخوت و مساوات کا عہدِ حاضر میں

عملی اور مثالی نمونہ پیش کر سکیں۔" اور کبھی یہ فرما کر کہ "اسلام ایک سوشل ڈیماکریسی ہے"!

(روایات بالمعنیٰ!)

لیکن افسوس کہ علامہ اقبال تو خالص 'مسنون عمر' میں پاکستان کے قیام سے لگ بھگ دس سال قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، قائدِ اعظم مرحوم بھی قیامِ پاکستان کے بعد کُل ایک سال زندہ رہے —— اور اُن کے بعد اُن کی عوامی تحریک کا ثمرہ اُچک لیا، اوّلاً نوابوں اور نوابزادوں اور زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں نے، اور بعد ازاں اس میں مستقل حصہ دار تو بن گئے کچھ نئے اور پُرانے سرمایہ دار اور باری باری حصہ بٹاتے رہے اعلیٰ سِول اور فوجی عہدہ دار! جس کے نتیجے میں قانونِ قدرت کے عین مطابق عوامی سطح پر ایک شدید احساسِ محرومی پیدا ہوا جو اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کے مانند بڑھتا چلا گیا —— اور —— اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اسی احساسِ محرومی کی پُرزور ترجمانی کی تھی، ذوالفقار علی بھٹو نے جس نے پاکستان کی سیاست کے اُس نئے اور زوردار عوامی دھارے کو جنم دیا تھا جس کی ایک طوفانی لہر پر سوار ہو کر وہ اب سے پندرہ سال قبل خود ایوانِ اقتدار تک پہنچے تھے!

واضح رہے کہ اس وقت مجھے نہ بھٹو صاحب کی ذات اور شخصیت سے کوئی بحث ہے نہ اُن کی سیرت و کردار سے، اور نہ اُن کے خلوص یا عدمِ اخلاص کے بارے میں کوئی گفتگو کرنی ہے، نہ اُن کی اہلیت یا نا اہلیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہے بلکہ فی الوقت میری گفتگو صرف اور صرف پاکستان کی عوامی سیاست کے درمیانی دھارے کے اُس 'INNER CORE' کی تعیین و تشخیص سے متعلق ہے جس نے اِس میں وہ قوتِ مقاومت پیدا کر دی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لاء سے بھی اُس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ مارشل لاء کے ذرا پس منظر میں جاتے ہی اُس کی طوفانی لہر سامنے آگئی —— اگرچہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ اس بار اس پر سواری بھٹو مرحوم کی صاحبزادی

مِس بے نظیر کرتی ہیں یا اُن کے سابق رفیقِ کار مسٹر جتوئی، یا اُن کی ایک نظر بندی کے دَوران اُن کے خلا کو پُر کرنے والے ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان —— یا کوئی اور!!

بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس دھارے کے بہاؤ کو روکنا نہ کسی چوتھے مارشل لاء کے لیے ممکن ہے نہ پانچویں کے، اور اس کے آگے نہ علماء کرام کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ مشائخ عظام، نہ پشتینی رئیس اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتے ہیں نہ نو دولتیے سرمایہ دار، نہ سردار اور وڈیرے اِس کا راستہ روک سکتے ہیں نہ زمیندار و جاگیر دار —— اور نہ کوئی میر اس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے نہ کوئی پیر —— زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اِس کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کی جائے!

اِس لیے کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارا یہ 'ڈان' بھی خالص مادیت ہی کے رُخ پر بہہ رہا ہے اور اس کے 'INNER CORE' کا سارا خارجی لبادہ یورپ سے مستعار لیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا کوئی براہِ راست سروکار نہ اللہ سے ہے نہ رسول ﷺ سے اور اس میں نہ ہدایتِ آسمانی سے کوئی اعتناء ہے نہ آخرت کی جوابدہی کا کوئی ذکر، لہٰذا عدلِ اجتماعی کے جملہ تصورات و معیارات بھی مغرب ہی سے ماخوذ ہیں اور اُن کے ضمن میں افراط و تفریط کی انتہاؤں کے مابین بھٹکنے کی کیفیت بھی لامحالہ وہیں کا چربہ ہے —— مزید برآں اِن کے جلو میں بے پردگی بھی ہے اور عُریانی بھی، اباحیت (PERMISSIVENESS) بھی ہے اور آوارگی بھی، لاف زنی بھی ہے اور بڑکیں بھی، بھنگڑہ بھی ہے اور "ہے جمالو" بھی —— اور اِن سے بھی بڑھ کر عبادات سے بے اعتنائی ہی نہیں، اُن کا استہزاء و تمسخر ہے، شریعت سے بے پرواہی ہی نہیں اس کے خلاف نشوز اور بغاوت ہے اور شعائرِ اسلامی کا عدمِ احترام ہی نہیں اُن کی باضابطہ توہین و تذلیل ہے —— وقِس علیٰ ذٰلک!

فکرِ اقبال کی روشنی میں اس صورتِ حال کا علاج بھی اس کی کُلّی نفی

(TOTAL NEGATION) اور بحیثیت مجموعی ردّ کر دینے (TOTAL REJECTION) میں نہیں بلکہ اس کے صحیح جزو کو قبول کرتے ہوئے غلط جزو کی اصلاح میں مضمر ہے!

بالکل ایسے جیسے حضرتِ علامہ نے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نیام سے تشبیہہ دی ہے جس میں سے ایمان باللہ کی تلوار نکال لی گئی ہو ؎

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

گویا نیام تو اپنی جگہ درست اور کارآمد ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس میں تلوار داخل کی جائے اسی طرح علمِ جدید میں فی نفسہٖ کوئی شے غلط نہیں ہے اور کائنات کے بارے میں معلومات کا جو عظیم خزانہ اس نے جمع کیا ہے وہ اپنی جگہ متاعِ بے بہا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس میں خالقِ کائنات کی معرفت و محبت کی چاشنی گھول دی جائے!

یہی وجہ ہے کہ حضرتِ علامہ نے اپنے اُس مشہور اور متنازعہ فارمولے میں کہ:

"MARXISM + GOD = ISLAM"

مغرب کے مادی فکر کی منطقی انتہا یعنی جدلی مادیت اور اس کے بھی نقطۂ عروج یعنی مارکسزم تک کو بالکلیہ ردّ نہیں کیا بلکہ صرف اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ اس میں ایمان باللہ کا تریاق شامل کر دیا جائے تو اس کی سمیّت اور زہرناکی ختم ہو جائے گی اور یہ اسلام کے بہت قریب آ جائے گا!

بنا بریں فکرِ اقبال کی روشنی میں اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ پاکستان کی عوامی سیاست کے عظیم دھارے کے آگے بند باندھنے کی لاحاصل ہی نہیں حد درجہ مُضر اور خطرناک کوشش کی بجائے اس میں ایمان و یقین کی چاشنی اور حکمت و معرفت کی روشنی شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح فی الجملہ اس کے رُخ کو آسمانی ہدایت کی جانب موڑ دیا جائے!

اور یہ کام، ظاہر ہے کہ، ہرگز آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل اور مشقت طلب ہے، البتہ

اس کے ضمن میں ایک بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں وہ لوگ جو اقبالؔ کے مدّاح و شیدائی اور اُن کے فکر و فلسفہ اور حکمت و بصیرت سے فیض حاصل کرنے والے اور خود کو اُن کی جانب منسوب کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ اقبالؔ کے متذکرہ بالا فارمولے کے مانند ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن بباطن صد درجہ محکم فارمولا یہ بھی ہے کہ:

> ’پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور احیاءِ اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدیدِ ایمان اور ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور دَورِ حاضر میں احیاءِ قرآن کا ایک نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے فکر و کلامِ اقبال!‘

اس لیے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ حاضر کے ذہنی و فکری ظروف و احوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جس قدر انکشاف اقبالؔ پر ہوا، اور کسی پر نہیں ہوا ——— اور موجودہ دَور کی اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر قرآن کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کی تعبیر و تبیین اور تشریح و توضیح کی ہے صرف ——— اور صرف اقبالؔ نے!

لیکن اس کے لیے اقبالؔ کے مدّاحوں اور شیدائیوں کو ع ”پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!“ کے مصداق کردار اور عمل کے میدان میں اترنا ہوگا، اور حلقۂ اقبال کو محض ایک روایتی اور ثقافتی طائفے کی صورت اختیار کرنے بلکہ، شدّتِ احساس کے لیے معذرت خواہ ہوں: مزارِ اقبالؔ کے مجاوروں کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے خود اقبالؔ کی ”خانقاہ“ سے بھی باہر نکل کر ”رسمِ شبیری“ ادا کرنی ہوگی! اور اس کے لیے اُنہیں اُس ہمت و جرأت، محنت و مشقت، ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے غرضی کے علاوہ جو کسی بھی عظیم مقصد کے لیے لازمی ولابدی ہیں، حسبِ ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے:

۱۔ اوّلاً جس دین و شریعت کے نام لیوا اور علمبردار ہیں اس پر خود عمل پیرا ہونا، اور اگر

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں گا کہ اقبال کے مدّاحوں اور شیدائیوں کے لیے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ یہی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خود اقبال کی 'بے عملی' کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ قطع نظر اس سے کہ خود حضرتِ علامہ نے اپنی بے عملی اور 'تن آسانی' کا ہمیشہ ایک کمی کی حیثیت سے برملا اعتراف کیا اور اُسے کبھی سند کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا، اُن کے فکر کے علو و عظمت کے پیشِ نظر اُن کی 'بے عملی' کی کوئی اہمیت نہیں رہتی بلکہ بلا مبالغہ مجھ ایسے لاکھوں انسانوں کا 'عمل' اُن کی 'بے عملی' پر نچھاور کیا جا سکتا ہے ——— لیکن دوسرا کون ہے جو اس کا مدّعی بن کر سامنے آسکے؟ مولانا مودودی مرحوم نے تو حضرتِ علامہ کو صوفیا کے 'ملامتیہ' گروہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اپنے 'عمل' کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے 'بے عملی' کا مظاہرہ کرتے ہیں، میں یہاں تک بھی نہیں جاتا بلکہ اسے اُس قاعدہ کلّیہ کے ذیل میں شمار کرتا ہوں کہ نابغہ لوگوں کا عمل بالعموم اُن کے فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا، تاہم اصل بات یہ ہے کہ حضرتِ علامہ ہمیں وہ فکر دے گئے جو اس دَور کے لاکھوں نہیں کروڑوں 'باعمل' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن اب اس فکر کو عملاً بروئے کار لانے کا اوّلین تقاضا ع "شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!" کے مصداق اُس اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعبیر حضرت علامہ نے یوں فرمائی کہ ع "عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار!"

اس ضمن میں اس مغالطے پر مستزاد جس تضاد کا مظاہرہ علامہ مرحوم کے حلقہ بگوشوں میں نظر آتا ہے اُس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ بالفرض وہ داڑھی اس لیے نہیں رکھتے کہ علامہ نے نہیں رکھی تو اسی دلیل کے تحت اپنے گھروں میں پردہ کیوں رائج نہیں کرتے حالانکہ اس موضوع پر حضرت علامہ کے افکار و آراء بھی نہایت واضح اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور اُن کا عمل تو اُس سے بھی کہیں زیادہ روشن و تابناک ہے! اس ضمن میں اس وقت مزید کچھ عرض کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ اس دَور میں حضرتِ علامہ کے اس شعر کا مصداقِ کامل میں ہوں کہ:

؎ کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند!

تاہم یہ صرف ایک مثال ہے۔ ؎ "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!"

۲۔ ثانیاً اس عظیم مقصد کے لیے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا جائے

اور اس ضمن میں حضرتِ علامہ کی اُن تنقیدوں اور لطیف اور مزاحیہ انداز کی اُن پھبتیوں کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے روایتی مُلّا پر چُست کی ہیں اُن کے اس طرزِ عمل کو نگاہ میں رکھا جاتے کہ انہوں نے ہمیشہ علماءِ حق کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے تمام تر مرتبۂ علمی و فکری کے باوجود بالغ نظر اور وسیع الذہن علماء سے خالص طالب علمانہ انداز میں کسبِ فیض میں کبھی اپنی توہین یا سبکی محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ اُن کی خط و کتابت اس پر شاہدِ عادل ہے۔

خصوصاً فقہ و قانونِ اسلامی کے ضمن میں اس دَور میں اجتہاد کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہونے کے باوجود انہوں نے خود اپنے آپ کو کبھی مجتہد مطلق نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کے باوجود کہ عربی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا، قرآن اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتے تھا اور خود وہ تمام عمر قرآن میں غوطہ زنی کرتے رہے تھے، حکمتِ دین اُن کے ذہن و فکر کی جزوِ لاینفک تھی اور تفقّہ فی الدّین اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا ـــــ قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے ضمن میں انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہ تن تنہا اس کے اہل ہیں، بلکہ کسے معلوم نہیں کہ وہ اپنی حیاتِ دینوی کے آخری ایّام تک پیہم مولانا سید محمّد انور شاہ کاشمیریؒ سے درخواست فرماتے رہے کہ وہ کسی طرح لاہور منتقل ہو جائیں تو دونوں مل کر وقت کی اس اہم ترین ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔

اِس ضمن میں قدیم اور جدید کے امتزاج کی جس قدر فکر اور خواہش حضرتِ علامہ کو تھی اُسی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی تحریروں میں اس امتزاج کی جھلک دیکھ کر حضرت علامہ نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم کے ذریعے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اُن کے 'تمکن' کی سبیل پیدا فرمائی ـــ مجھے حضرت علامہ کے اِس اقدام

کا پس منظر نظر آتا ہے اُن کے اس قطعے میں جو آج بھی اُن کے مرقد کی زینت بنا ہوا ہے کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم ۔ قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر ۔ دلے در سینۂ ملا گدازیم

لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم نے برِصغیر کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نقطۂ عروج کے آغاز پر تو یہ کہہ کر قومی سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ 'میں مسلمانوں کا نہیں صرف اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں' —— لیکن قیامِ پاکستان کے بعد 'اسلام کے کام' کے لیے قومی ہی نہیں خالص سیاسی راستہ اختیار کر لیا۔ اس پر تو اس وقت میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کاش کہ ایسا نہ ہوتا! اور مولانا مرحوم قیامِ پاکستان کے بعد بھی اپنے سابق انقلابی طریق کار ہی پر عمل پیرا رہتے، تاہم فکرِ اقبال کے شیدائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس چیز کی اہمیت حضرت علامہ کو اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ آج بھی نہایت اہم ہے! اور قدیم و جدید کے محکم امتزاج اور علماءِ حق کے تعاون و اشتراک کے بغیر پاکستان کی قومی سیاست کے دھارے کے رُخ کو اسلام کی جانب موڑنا ناممکن ہے۔

آخر میں جملہ شرکاءِ مجلس سے طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہی کے ساتھ ساتھ کارکنانِ مرکزیہ مجلسِ اقبال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے 'مجلسِ اقبال' میں شرکت کی دعوت دے کر میرا اعزاز و اکرام بھی فرمایا —— اور مجھے یہ موقع بھی عنایت فرمایا کہ اپنا دردِ دل ایسے منتخب روزگار حضرات کی محفل میں بیان کر سکوں اور 'اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین' کے مطابق سب سے آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اللہ کا کہ اُس نے مجھے بھی تین دن کی مختصر مدت کے اندر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ساتھیوں کو بھی ہمت دی کہ اسی قلیل عرصہ میں اس کی طباعت کا مرحلہ طے کر لیا۔ اگر ہم سے کوئی خیر بن آتے تو یہ سب اللہ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اور خطا ہوتی ہے تو وہ ہمارے نفوس کی شرارت سے۔ اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

حیات وسیرتِ اقبال

فلسفۂ اقبال

اور

ملّتِ اسلامیہ کے نام

اقبال کا پیغام

از

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تعارف (از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقیدِ حیات ہی تھے پروفیسر صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانحِ حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لیے اولاً ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لیے خود لکھی تھی اور ثانیاً 'پیغامِ اقبال' کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر مثنوی 'اسرار و رموز' کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا ـــــ پروفیسر صاحب کی اَن گنت تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آ گئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرما دی۔

اس تحریر کا اصل حصہ علامہ مرحوم کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اس پیغام پر مشتمل ہے جو انہوں نے ملّتِ اسلامی کو دیا ہے۔ تاہم حیات و سیرتِ اقبال کا اجمالی خاکہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصّل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں، تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدرے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بگوش اور عقیدت مند کے قلم سے نکلی تھی۔ خود علامہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد، اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکرین پر جو نوٹ ضمناً اس مضمون میں آ گئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور ان سے اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں مستحضر رکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ بہت سی باتیں جو اس مضمون میں بصیغۂ حال بیان ہوئی ہیں کب کی قصۂ ماضی بن چکیں چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے ـــــ اس میں ایک خزانۂ عبرت پنہاں ہے ؎

"جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہو گا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!"

(ماخوذ از 'میثاق' بابت مئی ۱۹۶۹ء)

حیات و سیرتِ اقبال

ایک اجمالی خاکہ

علامۃ العصر ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال مدظلہ، کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے جن کی گوت "سپرو" تھی۔ وہ ایک باکمال ولی اللہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوتے تھے اور اس ولی کا روحانی تصرف آج تک ان کے خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسنِ عقیدت جس نے سپرو کو شیخ بنا دیا، ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اِسی لیے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں۔ مثلاً:

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ　　بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوتے تھے۔ والدین نے اقبال نام رکھا۔[*] میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہو گا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحبِ اقبال ہو گا۔ اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا، جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔

---

[*] حاشیہ کے لئے صفحہ ۱۰۳ ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام حواشی ان مضامین کے اختتام پر جمع کر دیے گئے ہیں۔

ابتداءً مکتب میں داخل ہوئے اس کے بعد سکول میں نام لکھایا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کر کے مقامی (مرے کالج) میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحبؒ[۲] کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاد کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا۔ فیض صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت شدہ تھا لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

غالباً شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام النادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علامہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چشموں میں معروف اور ممتاز رہے۔

اسی سال آپ اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرار مقرر ہوئے دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔

جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن نے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دور میں ڈاکٹر آرنلڈ[۳] کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو مدۃ العمر باقی رہا۔ آرنلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسر آ جائے، وہ رفتہ رفتہ محقق بن جاتا ہے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اور زیادتی ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے[۴] کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری

لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ شام کی گاڑی سے لاہور واپس آئے۔ دورانِ قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علما اور فضلا کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، ڈاکٹر براؤن، ڈاکٹر نکلسن اور ڈاکٹر سارلے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ پہلے انار کلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصہ سے میکلوڈ روڈ پر قیام ہے۔ اقبال کی وجہ سے مجھے اس سڑک سے وہی وابستگی ہے۔ جو مجنوں کو کوئے لیلیٰ سے تھی۔

۱۹۳۳ء میں جاوید منزل ———— ۱۹۳۸ء میں وفات

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پریکٹس کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل و دماغ، فلسفیانہ مزاج، صوفیانہ افتادِ طبع اور عالمانہ طرزِ زندگی رکھتا ہو، جو VISIONARY IDEALIST ہو جس کی توجہ تمام تر ملتِ اسلامیہ کی بہبود پر مبذول رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بہت سا وقت EGO اور REALITY کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرارِ خودی کا مصنف ہو اسے "نظائرِ دیوانی" اور "امثلۂ فوجداری" سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے؟

۱۹۲۳ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی خطابات یا اعزازات کے لیے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی

خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا میں رہتے ہیں جہاں SIR اور SERVANT دونوں یکساں نظر آتے ہیں ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ء سے سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف احباب اور کالج کے طلبہ تک محدود تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا۔

غالباً دوستوں نے مشورہ دیا ہو گا کہ آپ کو کسی باکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ استاد بہر حال، خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہو گا۔ بہرکیف آپ نے بلبل ہند نواب فصیح الملک بہادر، مرزا داغ دہلوی، استاد اعلیٰ حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کر لیجئے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لیے بھیجیں۔

تلمذ کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ ہاں بقول آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ" اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی"۔ اقبال کی خوش نصیبی کہ اُسے داغ جیسا زبان دان اور کامل الفن استاد ملا، اور داغ کی بلند بختی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے۔"

اقبال نے خود بھی ایک غزل کے مقطع میں، داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں　　مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

سب سے پہلے لاہور میں، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے:۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض　　ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو شعراء قوموں کو زمزمہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زمانی دونوں قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز وہی کرلی جو اُن کے لیے مناسب تھی۔ یعنی ۱۹۱۱ء سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہوگئی۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ نے "خون شہداء کی نذر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کر دی۔ جس وقت آپ نے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا۔ آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔ والا مضمون ہے ہر آئندہ نظم سوز دروں کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی سیرت

علامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی عدیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس، سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو غرضیکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت

آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں (PLAIN LIVING AND HIGH THINKING,

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کا درِ فیض ہر کس و ناکس کے لیے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو بآسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک السلام علیکم کہہ کر خوانِ علم و فضل کی زلہ ربائی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاگنڈا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملتِ اسلامیہ کی بہبود کی تدبیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ ؏

شہرتِ شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکارِ دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوزِ عشقِ مصطفےٰؐ سے مالا مال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حبِ رسولؐ کے لیے نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ چاہیے نہ طویل اللحیہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف دردآشنا دل درکار ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی

یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ کی پرستش کرتا انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذبات محبت کی قدرے ترجمانی کرتا ہے۔

علامہ کی تصنیفات

(۱)	علم الاقتصاد	اُردو	نایاب ہے۔
۲۔	فلسفہ ایران	انگریزی	مل سکتی ہے
۳۔	اسرارِ خودی	فارسی	″ ″ ″
۴۔	رموزِ بے خودی	″	″ ″ ″
۵۔	پیامِ مشرق	″	″ ″ ″
۶۔	زبورِ عجم	″	″ ″ ″
۷۔	لکچرز مدراس	انگریزی	″ ″ ″
۸۔	جاوید نامہ	فارسی	″ ″ ″
۹۔	بانگِ درا	اُردو	″ ″ ″
۱۰۔	بالِ جبریل	″	″ ″ ″
۱۱۔	ضربِ کلیم	″	″ ″ ″
۱۲۔	مسافر	فارسی	″ ″ ″
۱۳۔	"پس چہ باید کرد"	″	″ ″ ″
۱۴۔	ارمغانِ حجاز	فارسی و اُردو	″ ″ ″

قدر دانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء، حکماء، فلاسفہ کی قدر اُن کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں کافی ہو چکی ہے۔

(۱) ترکی زبان میں عربی زبان میں اور انگریزی زبان میں ان کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن نے اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ کئی جرمن علماء نے علامہ کے کلام اور فلسفہ پر تبصرہ جرمن زبان میں شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں میں، ان کے فلسفہ پر محققانہ مضامین لکھے گئے ہیں۔

(میثاق مئی ۱۹۶۹ء)

فلسفۂ اقبال

علامہ اقبال مرحوم بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کے فلسفہ کو عام طور پر "فلسفۂ خودی" کا نام دیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ ان کا اصل فلسفہ ہے کیا؟

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ علامہ کی معرکۃ الآرا مثنوی "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا ہے لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ پروفیسر موصوف نے "اسرار خودی" کو سمجھنے کے لیے اوّلاً ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم سے مدد لی جو اس وقت کیمبرج میں اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے (یہ ذکر سنہ ۱۹۱۸ء کا ہے) اور پھر جب اس ساری تگ و دو کے باوجود وہ علامہ مرحوم کے فلسفہ کو اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو انہوں نے خود علامہ سے رجوع کیا اور فرمائش کی کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبان انگریزی تحریر کر دیں۔ علامہ نے اس فرمائش کی تعمیل میں جو مضمون لکھا اسے پروفیسر نکلسن نے "Secrets of the Self" کے شروع میں شامل کر دیا جو سنہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذیل میں ایک تو اس تحریر کا وہ ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر چشتی صاحب نے سنہ ۱۹۳۲ء میں کیا تھا اور دوسرے مثنوی اسرار خودی کا وہ خلاصہ بھی درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں خود مرتب کیا تھا۔ مزید برآں "رموز بے خودی" کا خلاصہ بھی آئندہ صفحات میں قارئین کی نظر سے گزرے گا، اسے بھی پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں مرتب کیا تھا۔

اس طرح یہ مضمون نہ صرف یہ کہ علامہ اقبال کے فلسفے پر نہایت مختصر لیکن انتہائی جامع اور ساتھ ہی غایت درجہ عام فہم دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے اس پیغام کا خلاصہ بھی سامنے آجائے گا جو علامہ مرحوم نے امتِ مسلمہ کو دیا تھا اور یہ تینوں مضمون مل کر ایک مکمل وحدت کی صورت اختیار کر لیں گے۔ واضح رہے کہ 'رموزِ بے خودی' کا ترجمہ بعد میں پروفیسر آربری نے کیا جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ——— اسرار احمد ('میثاق' جون ۱۹۶۹ء)

◆

(۱)

اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ

جو انہوں نے نکلسن کی فرمائش پر خود تحریر فرمایا

ترجمہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ خود خدا بھی اک فرد ہے۔ اگرچہ فردِ کامل ہے۔ کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلّی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بدنظمی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ افرادِ کائنات کی تعداد معیّن نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات فعلِ مختتم نہیں ہے۔ ہنوز مراتبِ تکمیل طے کر رہی ہے اسی لیے اس کے متعلق کوئی بات حتمی اور ادعائی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ فعلِ تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس

کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے اس حد تک اس کو بھی فعل تخلیق میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں: "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹا دے۔

میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: "تخلقوا باخلاق اللہ" یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرو پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہوگا۔ اسی قدر اس کے اندر شان یکتائی اور رنگ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے خودی (EGO) ہے۔ اگرچہ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے لیکن ابھی تک فرد کامل کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ فرد جس قدر خدا سے قریب ہوگا۔ اسی قدر کامل ہوگا۔ قرب الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے، بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے۔ حیات دراصل اک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان پر غلبہ پا کر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاصہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی حفاظت اور ترقی کے لیے اس نے آلات اور وسائل پیدا کر لیے ہیں۔ مثلاً حواس اور ادراک جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتی ہے۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن مادہ کوئی بری چیز نہیں ـــ بلکہ حیات

کے حق میں مفید ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

جب حیات یا خودی مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے۔ خودی ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْجَبْرِ وَالْاِخْتِیَارِ" حیات جب تقرب الٰہی حاصل کر لیتی ہے تو اختیار کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیات یا خودی، مرتبہ جبر سے مرتبۂ اختیار تک پہنچنے کا نام ہے۔

جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نام الیغو یا شخص یا خودی ہو جاتا ہے اور شخصیت جدوجہد کی مسلسل حالت سے عبارت ہے شخصیّت کا قیام اسی حالت کے تسلسل پر منحصر ہے اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطّل یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی اور یہ بات خودی کے حق میں سم قاتل ہے --- شخصیّت (PERSONALITY) چونکہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لیے اس کا فرض اوّلین یہ ہے کہ وہ اس جوہر بے بہا کو مسلسل سرگرم عمل رکھے اور وہ عمل ایسا ہو کہ خودی کی ترقی کا باعث ہو۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "عمل صالح" کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔

مسلسل جدوجہد ہی زندگی ہے (ع دوامِ ماز سوز ناتمام است) جو شئے شخصیت کو پیہم جدوجہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے اس لیے حسن یا اچھی ہے اور جو شئے شخصیت کو ضعیف یا معطل کرے وہ بُری ہے۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔

PERSONALITY AS THE CRITERION OF VALUE

مَیں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب اُن فلسفیانہ مذاہب

کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اُس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پر فائز کرنے کے لیے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے اُسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لیے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبۂ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لیے جد و جہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار و اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالتِ کاوش پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوّف اس حالت کے لیے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالتِ کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالمِ برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کر لیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ وِلڈن کار نے لکھا ہے حشرِ اجساد بھی عین قرینِ عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لیے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقیدّ بالمکان زمانہ، اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لیے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ در اصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ مقیدّ بالزمان زندگی میں بھی کبھی کبھی

ہمیں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل 'آنی' ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شانِ انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات تمہیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدارِ فکر بناتا ہے، وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا" لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ آپؐ نے اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست   بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

تربیت خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستورِ الٰہی کی اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی۔

نیابتِ الٰہی، دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں آ کر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور

علم، جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانۂ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابتِ الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدرِ اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افرادِ یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

'اسرارِ خودی'
کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لیے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱) شاعری علامہ کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعۂ اظہارِ خیالات ہے۔ لکھتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست   بت پرستی بت گری مقصود نیست [۱۲]

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں حقیقت سے نا آشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔

(۲) خودی اصل نظامِ عالم ہے اور تسلسل حیات استحکام خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است   پس بقدرِ استواری زندگی است [۱۳]
قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند   ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند [۱۴]

(۳) خودی کی حیات و بقاء، تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصلِ او در آرزو پوشیدہ است [۱۵]
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات   غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات [۱۶]
زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد   شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد [۱۷]
علم از سامانِ حفظِ زندگی است   علم از اسبابِ تقویمِ خودی است [۱۸]

(۴) خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پایندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر [۱۹]
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست   اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست [۲۰]
خاک نجد از فیض او چالاک شد   آمد اندر وجد و بر افلاک شد [۲۱]

(۵) عشق کا طریقہ محمد عربیؐ سے سیکھنا چاہیے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است   آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است [۲۲]
آنکہ بر اعداء درِ رحمت کشاد   مکہ را پیغامِ لَا تَثْرِیبَ داد [۲۳]
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت   آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت [۲۴]

چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست   اوست جانِ ایں نظام و او یکیست[۲۵]

(۶) بغیر آپؐ کی اتباع کے خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار   تا کمندِ تو کند یزداں شکار[۲۶]
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا   شرحِ اِنِّی جَاعِلٌ سازد ترا[۲۷]

(۷) خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ   الحذر از منّتِ غیر الحذر[۲۸]
رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو   موجِ آب از چشمۂ خاور مجو[۲۹]
تا نباشی پیشِ پیغمبرؐ خجل   روز فردائے کہ باشد جاں گسل[۳۰]
ہمّت از حق خواہ و با گردوں ستیز   آبروئے ملّتِ بیضا مریز[۳۱]

(۸) جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کو مسخر کر لیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود   ماہ از انگشتِ او شق می شود[۳۲]
در خصوماتِ جہاں گردد حکم   تابعِ فرمانِ او دارا و جم[۳۳]

(۹) مسئلۂ نفیِ خودی اقوامِ مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوامِ غالبہ کے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں اس لیے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمّتی   کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی[۳۴]

(۱۰) افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لیے مُضر ہے۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود   جانِ او وارفتۂ معدوم بود[۳۵]
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت   خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[۳۶]
قوم ہا از سُکرِ او مسموم گشت   خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت[۳۷]

(۱۱) ادبیاتِ اسلامیہ بھی مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعراء اور ادباء کو چاہیے کہ ایسے مضامین سپردِ قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن　بر عیارِ زندگی او را بزن [۳۸]
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است　چوں درخشِ برق پیش از تندر است [۳۹]
فکرِ صالح در ادب می بایدت　رجعتے سوئے عرب می بایدت [۴۰]

(۱۲) تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ۔

(ا) اطاعت

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　می شود از جبر پیدا اختیار [۴۱]
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی　تو چرا غافل زایں ساماں روی [۴۲]
شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو　از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو [۴۳]

(ب) ضبطِ نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　می شود فرماں پذیر از دیگراں [۴۴]
تا عصائے لا الٰہ داری بدست　ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست [۴۵]
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد　فارغ از بندِ زن و اولاد شد [۴۶]
می کند از ما سویٰ قطعِ نظر　می نہد ساطور بر حلقِ پسر [۴۷]

(ج) نیابتِ الٰہی

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است　ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است [۴۸]
از رموزِ جزو و کل آگہ بود　در جہاں قائم بامر اللہ بود [۴۹]
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر　ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر [۵۰]
مدعائے عَلَّمَ الاسماستے　سرِّ سبحان الذی اسراستے [۵۱]
ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است　از جلالِ او نجاتِ عالم است [۵۲]

(۱۳) حیاتِ ملی کا تسلسل، روایاتِ ملیہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنی ملی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات پر قائم رہنا چاہیے۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن   پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن[۵۳]

(۱۴) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیر ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است   مسلم ار عاشق نباشد کافر است[۵۴]
تابعِ حق دیدنش نادیدنش   خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش[۵۵]
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار   تا ز تو گردد جلالش آشکار[۵۶]
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید   تیغِ او بر سینۂ او آرمید[۵۷]
زندگی از طوفِ دیگر رستن است   خویش را بیت الحرم دانستن است[۵۸]

(۱۵) موجودہ عقل و خرد اور تہذیب دراصل جہالت اور سفاہت ہے۔ مسلمانوں کو اس مادی تمدن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لیے کمزور ہے۔

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است   معنیٔ اسلام ترکِ آفل است[۵۹]
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے   کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے[۶۰]
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است   بت پرست و بت فروش و بتگر است[۶۱]

(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ چنانچہ مرشد رومیؒ کہتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را   اوست سیدِ جملہ موجودات را[۶۲]

امام شافعیؒ نے وقت کو سیف قاطع قرار دیا ہے۔ وقت دراصل حیات ہے اور کوئی

شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سِرِّ ایں شمشیر چیست　　آب او سرمایہ دار از زندگیست[٦٣]
پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود　　قوتِ او از ہمیں شمشیر بود[٦٤]
تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ　　از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ[٦٥]
زندگی از دہر و دہر از زندگی است　　'لاتسبوا الدہر' فرمانِ نبیؐ است[٦٦]
نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت　　غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت[٦٧]

(١٧)　آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ:۔

(ا)　عشق را از شغلِ لَا آگاہ کن　　آشنائے رمزِ اِلَّا اللہ کن[٦٨]

(ب)　موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے یعنی محمل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں ہیں مثل شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدایا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہم دم عطا کر۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے　　از رموزِ فطرتِ من محرمے[٦٩]
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش　　باز بینم در دلِ او روئے خویش[٧٠]

ملّتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصۂ رموزِ بے خودی

جس طرح خودی کے معنی تکبّر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱) ربطِ فرد و ملت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دُور رہتا ہے"۔

فرد می گیرد ز ملت احترام   ملت از افراد می یابد نظام[۴۱]

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد   شعلہ ہائے نغمہ در عُودش فسرد[۴۲]

انسان کے اندر "جوہرِ نوری" ہے۔ قوّتِ ادراک اُسی کی ایک شعاع ہے۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است   جزوِ اورا قوّتِ کُل گیری است[۴۳]
در جماعت خود شکن گردد خودی   تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۴۴]

(۲) ملت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوّت سے ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکارِ مدینہؐ نے

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است   ہستیٔ کوکب زکوکب محکم است[75]

نبیؐ افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ   زیں بتانِ بے زبان کمتر نۂ[76]

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سوئے یک مدعایش می کشد   حلقۂ آئیں بپایش می کشد[77]
نکتۂ توحید باز آموزدش   رسم و آئینِ نیاز آموزدش[78]

(۳) ارکانِ اساسی (BASIC PRINCIPLES OF ISLAM)

(ا) اسلام کا رکنِ اوّل توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے۔ مومن میں دین، حکمت، آئین، زور، قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات   چشم می بیند ضمیرِ کائنات[79]
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود   کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[80]

ملّتِ اسلامیہ کے لیے توحید بمنزلۂ روحِ رواں ہے۔ اگر توحید کا تصوّر خارج کر دیا جائے تو ملّتِ اسلامیہ لاشۂ بے جان رہ جائے گی۔

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ   ساز مارا پردہ گرداں لا الٰہ[81]

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما   رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[82]

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لیے ملّتِ اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔

ملّت از یک رنگیٔ دلہاستے   روشن از یک جلوہ ایں سیناستے[83]
قوم را اندیشہ ہا باید یکے   در ضمیرش مدّعا باید یکے[84]

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

برنسب نازاں شدن نادانی است   حکمِ او اندر تن و تن فانی است[۸۵]
ملتِ مارا اساسِ دیگر است   ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است[۸۶]
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم   یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم[۸۷]

(۳) ب: یاس و حزن و خوف اُمّ الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی نا اُمید نہ ہو کیونکہ نا اُمیدی حیات کے لیے سامانِ مرگ ہے اسی لیے اللہ فرماتا ہے لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر   از نبی تعلیمِ لَاتَحْزَنْ بگیر[۸۸]
قوتِ ایماں حیات افزایدت   وردِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ بایدت[۸۹]
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است   کاروانِ زندگی را رہزن است[۹۰]
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست   اصلِ او بیم است اگر بینی درست[۹۱]
ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است   شرک را در خوف مضمر دیدہ است[۹۲]
خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس   خوفِ غیر از شرکِ پنہان است و بس[۹۳]

(۴) رکنِ دوم رسالت: جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تنِ مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسولؐ مسلم کے قلب و جگر کی قوت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہبِ فطرت عطا کیا اور اس لیے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہو جائے۔ خدا نے ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کر دی

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ   از خدا محبوب تر گردد نبیؐ[۹۴]
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم   در رہِ حق مشعلے افروختیم[۹۵]

لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خداست   پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است[۹۶]

(۴) ب: رسالتِ محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ اندر دلش   حریت سرمایۂ آب و گلش[۹۷]
ناشکیبِ امتیازات آمدہ   در نہادِ او مساوات آمدہ[۹۸]

اس کے بعد علامہؒ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں امام حسینؓ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است   پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است[۹۹]
ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست   پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست[۱۰۰]
رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم   ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم[۱۰۱]

رمزِ قرآن سے علامہؒ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵) چونکہ ملتِ محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں ہیں اس لیے ملتِ محمدیؐ بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لیے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا   مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
مسلم استی دل باقلیمے مبند   گم مشو اندر جہانِ چون و چند[۱۰۲]
دل بدست آور کہ در پہنائے دل   می شود گم ایں سرائے آب و گل[۱۰۳]

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین

اس کے لیے مسجد ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است   ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است[۱۰۴]
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو   یعنی از قیدِ مقام آزاد شو[۱۰۵]
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد   چوں فلک در شش جہت آباد شد[۱۰۶]

(۶)   وطن اساسِ ملّت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لیے ازبس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زریں اصول تباہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت   ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت[۱۰۷]
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند   آدمیت گم شد و اقوام ماند[۱۰۸]

(۷)   جس طرح ملّتِ محمدیؐ محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقیّد بالزّمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے لیکن ملتِ محمدی اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خداتعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

امّتِ مسلم ز آیاتِ خداست   اصلش از ہنگامہ قَالُوْا بَلٰی ست[۱۰۹]
از اجل ایں قوم بے پرواستے   استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے[۱۱۰]
تا خدا اَنْ یُّطْفِئُوْا فرمودہ است   از فسردن ایں چراغ آسودہ است[۱۱۱]

(۸)   نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اس لیے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لیے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملّی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستورِ حیات اور ضابطۂ عمل بنانا چاہیے۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس   باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس[۱۱۲]

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم   حکمتِ او لایزال است و قدیم[۱۱۳]
حرفِ اورا ریب نے، تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے[۱۱۴]
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ او رحمۃٌ للعالمیں[۱۱۵]

اس کے بعد علامہؒ نے مسلمِ سست پیما سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں رازِ حیات بیان کر دیا ہے۔

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو   شیوہ ہائے کافری زندانِ تو[۱۱۶]
قطع کردی امرِ خود را در زُبُر   جادہ پیمائی اِلیٰ شَیٍٔ نُکُر[۱۱۷]
گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن[۱۱۸]

(۹)   انحطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں بلکہ روایاتِ ملی پر عامل ہونے کے ہیں۔ علامہؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک   پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے[۱۱۹]

یعنی تقلید کو بُرا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے اولیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کورانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایاتِ ملی کی (CULTURAL TRADITIONS) حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است   معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است[۱۲۰]

اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کر دیتے ہیں۔

نقش بر دل معنیٔ توحید کن   چارۂ کارِ خود از تقلید کن[۱۲۱]

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط   قوم را برہم ہمی پیچد بساط[۱۲۲]

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر[۱۲۳]

از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است[۱۲۴]

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست[۱۲۵]

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرنا اور یک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا۔ سنّتِ نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۱۰) اتباعِ آئینِ الٰہیہ سے سیرتِ ملّی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے۔ اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علمِ حقیقت شریعت سے جُدا نہیں ہے اور سنّت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبت کی جائے۔ "ہر کہ عشق مصطفےٰ الخ" اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباعِ شریعت کریں۔ ملّت کا نظام اتباعِ شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہو جاتا ہے تو ملّت کو دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" (SECRET) پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوت اتباعِ شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

ہترِ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟ زیستن اندر خطرہا زندگیست [۱۲۶]

آنحضرت صلعم کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات [۱۲۷]

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبویؐ سے رُو گردانی کی رمزِ بقا سے محروم ہو گئے۔

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت قوم را رمزِ بقا از دست رفت [۱۲۸]

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر [۱۲۹]
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گزشت [۱۳۰]
قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی با عرب در ساز تا مسلم شوی [۱۳۱]

(۱۱) سیرتِ قومی میں اتباعِ رسولؐ سے حسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرشد رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

گل از ختم الرسلؐ ایامِ خویش   تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش[۱۳۲]

مسلمانوں کے لیے حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنما بنانا کارِ نادانی ہے۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ   گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰؐ[۱۳۳]
از بہارش رنگ و بو باید گرفت   بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت[۱۳۴]
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم   رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم[۱۳۵]
از مقامِ او اگر دور ایستی   از میانِ معشرِ ما نیستی[۱۳۶]

(۱۲) حیاتِ ملیہ کے لیے ایک مرکزِ محسوس بھی اشد ضروری ہے اور مسلمانوں کا مرکز بیتُ اللہ ہے۔ سب مسلمانوں کو اس سرزمین کو اپنا مرکز یقین کرنا چاہیے۔ مکّہ واقعی ہمارا کعبۂ مقصود ہے، اور جسے مکّہ سے محبت نہیں اس کے ایمان میں خلل ہے جو جماعت مکّہ کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین کو اپنا مرکز قرار دے وہ اسلام سے خارج ہے۔

ہمچناں آئینِ میلادِ امم   زندگی بر مرکزے آید بہم[۱۳۷]
قوم را ربط و نظام از مرکزے   روزگارش را دوام از مرکزے[۱۳۸]
راز دار و رازِ ما بیت الحرام   سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام[۱۳۹]
در جہاں مارا بلند آوازہ کرد   با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد[۱۴۰]

(۱۳) تنظیمِ حقیقی کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ افرادِ ملّت کے سامنے کوئی نصب العین ہو اور ہر فرد اس کے حصول میں منہمک ہو اور امّتِ محمّدی کا نصب العین یہ ہے کہ توحید کی حفاظت اور اشاعت کی جائے گویا ہر مسلمان مبلّغ اسلام ہے۔

مدّعا رازِ بقائے زندگی   جمعِ سیمابِ قوائے زندگی[۱۴۱]

چوں حیات از مقصدے محرم شود　　ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود[۱۴۲]
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل　　کیف وکم ازوے پذیرد ہر عمل[۱۴۳]
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست　　حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست[۱۴۴]
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے　　گر مسلمانی نیا سائی دمے[۱۴۵]

آجکل جبکہ الحاد اور مادیت کا زور ہے قرآنی تعلیمات کی اشاعت ازبس ضروری ہے۔ موجودہ مشکلات کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔ پس مسلمانوں کو یکسر تبلیغ واشاعتِ اسلام میں منہمک ہو جانا چاہیے۔

(۱۴) حیاتِ ملّی میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ عہدِ ماضی میں مسلمانوں کا یہی شعار تھا لیکن اب علوم وفنون سے بے بہرہ ہیں تحقیق واجتہاد کو کفر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی درکنار تنزّل کر رہے ہیں۔

ما سوا از بہرِ تسخیر است و بس　　سینۂ او عرضۂ تیر است و بس[۱۴۶]
غنچۂ؟ از خود چمن تعبیر کن　　شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن[۱۴۷]
خیز و واکن دیدۂ مخمور را　　دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را[۱۴۸]
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است　　امتحانِ ممکناتِ مسلم است[۱۴۹]
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد　　جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد[۱۵۰]
تو کہ مقصودِ خطابِ اُنظُری　　پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری[۱۵۱]
علمِ اسما اعتبارِ آدم است　　حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است[۱۵۲]

(۱۵) حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ ملت میں بھی فرد کی طرح اپنی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور اس احساس کی تولید اور تکمیل اپنی ملّی روایات (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور اشاعت سے ممکن ہے۔

ملت میں خودی کے احساس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد اپنی جگہ بہبودِ ملّت کا ذمہ دار ہو۔

اگر زید کو تکلیف پہنچے تو تمام جماعت اس تکلیف کو محسوس کرے۔ اس کا نظارہ دہلی نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا جبکہ بارہ سپاہیوں اور ان کے افسر نے بخوشی میگزین میں آگ لگا دی اور خود بھی اس میں جل کر مر گئے تاکہ وہ بارود اُن کے دشمن اُن کے بھائیوں کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔ وہ بظاہر مر گئے لیکن بباطن زندہ ہیں اور لارڈ ولنگڈن سر ہربرٹ ایمرسن اور دوسرے گورنران صوبجات کی شکل میں آج ۱۹۳۳ء میں ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو ان کا ابھرنا اور ترقی کرنا معلوم۔ فی الحال تو یہ کیفیت ہے کہ ہندو سے زیادہ مسلمان مسلمان کا دشمن ہے۔ میونسپل کمیٹی اور کونسل سب جگہ منافرت اور منافقت کا بازار گرم ہے۔ (واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۳ء کی ہے: مدیر)

اس احساس کو پیدا کرنے کے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنا اور اپنی روایاتِ ملّی کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ زندہ اقوام اپنی روایات کی بہت حفاظت کرتی ہیں اور بچوں کے قلوب میں ان روایات کا نقش قائم کرتی ہیں لیکن ہندوستان میں ہماری تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انہیں کلرکوں کی ضرورت ہے نہ کہ قومی درد رکھنے والوں کی۔

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دُودھ ہے ڈبّے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

ربطِ ایّام است مارا پیرہن   سوزنش حفظِ روایاتِ کہن ۱۵۳
چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ   داستانے قصّہ افسانہ ۱۵۴
ایں ترا از خویشتن آگہ کند   آشنائے کار و مردِ رہ کند ۱۵۵
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال   رشتہ ماضی ز استقبال و حال ۱۵۶

(۱۶) بقائے نوع امومت (MOTHERHOOD) پر منحصر ہے اس لیے اسلام میں امومت کے احترام کو فرضِ عین قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے "عورت" کو بڑا بلند درجہ عنایت کیا ہے کیونکہ عورت مرد کے لیے باعث

تسکین اور کائنات کے لیے موجبِ رونق ہے۔ مرد میں عورت ہی کی وجہ سے نغمہ پیدا ہوتا ہے بلکہ مرد کے لیے موجبِ زینت و آسائش ہے اسی لیے آنحضرت صلعم نے خوشبو اور نماز کے ساتھ اس کا ذکر بھی فرمایا۔

جو مسلمان عورت کو اپنا خادم یا ماتحت خیال کرتا ہے وہ فہمِ قرآن سے محروم ہے لکھتے ہیں:

آنکہ نازد بر وجودش کائنات   ذکرِ او فرمود باطیب و صلوٰۃ[۱۵۷]
مسلمے کو را پرستارے شمرد   بہرہ از حکمتِ قرآں نبرد[۱۵۸]
نیک اگر بینی امومت رحمت است   زانکہ او را با نبوت نسبت است[۱۵۹]
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است   سیرتِ اقوام را صورت گر است[۱۶۰]
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں   زیرِ پائے امہات آمد جناں[۱۶۱]
ملت از تکریمِ ارحام است و بس   ورنہ کارِ زندگی خام است و بس[۱۶۲]
حافظِ رمزِ اخوت مادراں   قوتِ قرآن و ملت مادراں[۱۶۳]

(۱۷) عورتوں کے لیے سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ اُسوۂ حسنہ ہیں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ   مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ[۱۶۴]
آں ادب پروردۂ صبر و رضا   آسیا گردان و لب قرآں سرا[۱۶۵]

(۱۸) خطاب بہ مخدراتِ اسلام۔ علامہ مسلمان عورتوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ ماداں اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سب سے پہلے اسلام اور اسلامی روایات سے آگاہ کریں اور اپنے فرض کو پہچانیں۔ وہ ذمہ دار ہیں اور بچوں کی سیرت انہی کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔

موجودہ زمانہ بڑا پُرآشوب ہے کفر و الحاد کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ مسلمان بچوں کو قرآنی تعلیمات سے مسلح کر کے کارزارِ عالم میں بھیجیں۔

کودکِ ما چوں لب از شیر توشست   لا الٰہ آموختی او را نخست[۱۶۶]

می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما   فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما[۱۶۷]
دورِ حاضر تر فروش و پُرفن است   کاروانش نقدِ دیں را رہزن است[۱۶۸]
کور و یزداں ناشناس ادراکِ اُو   ناکساں زنجیریِ پیچاکِ اُو[۱۶۹]

ہوشیار از دستبردِ روزگار   گیر فرزندانِ خود را در کنار[۱۷۰]

(۱۹) آخر میں علامہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔ میں اس کا خلاصہ بھی طوطیائے چشم بناتا ہوں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت صدیق اکبرؓ کو خواب میں دیکھا تو اُن سے کہا کہ اُمّتِ مرحوم کی بہبود کی کوئی صورت بتائیے انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کو سورۂ اخلاص سے آب و تاب حاصل کرنی چاہیے۔

توحید کا رنگ پیدا کر لو سارے عقدے حل ہو جائیں گے۔

بایکی ساز، از دوئی بردار رخت   وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت[۱۷۱]

خدا نے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا وہ اب ترک، افغان اور ہندی بنے ہوئے ہیں۔ قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ کے معنی زبان سے ادا کرنے سے کام نہیں بنتا، جب تک مسلمان وحدت کا رنگ اپنے اندر نہ پیدا کریں۔ جس طرح اُن کا خدا ایک ہے اسی طرح انہیں بھی ایک ہونا چاہیے۔

یک شو و توحید را مشہود کن   غائبش را از عمل موجود کن[۱۷۲]

لذتِ ایماں فزاید در عمل   مُردہ آں ایماں کہ ناید در عمل[۱۷۳]

(ب) اَللّٰہُ الصَّمَدُ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے تم بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کو کعبۂ مقصود بنا لو۔

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست   زندگانی گردشِ دولاب نیست[۱۷۴]
مسلم استی بے نیاز از غیر شو   اہلِ عالم را سراپا خیر شو[۱۷۵]
راہ دشوار است ساماں کم بگیر   در جہاں آزاد زی آزاد میر[۱۷۶]

پشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را   سر بدہ از کف مدہ ناموس را [۱۷۷]
بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است   رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است [۱۷۸]
آفتاب استی یکے در خود نگر   از نجومِ دیگراں تابے مخر [۱۷۹]
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے   ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے [۱۸۰]

(ج) جس طرح اللہ تعالیٰ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے اُسی طرح مسلم رنگ و خون سے بالاتر ہے۔ اسلام میں حسب و نسب، رنگ، قوم، ذات پات، نسل، زبان، دولت ثروت یہ سب ہیچ ہیں۔

فارغ از اُمّ و اب و اعمام باش   ہمچو سلمانؓ زادۂ اسلام باش [۱۸۱]
گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ   رخنہ در کارِ اخوّت کردۂ [۱۸۲]
دل بہ محبوبِ حجازیؐ بستہ ایم   زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم [۱۸۳]
رشتۂ ما یک تولّایش بس است   چشمِ ما را کیفِ صہبایش بس است [۱۸۴]
عشق در جان و نسب در پیکر است   رشتۂ عشق از نسب محکم تر است [۱۸۵]
ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است   بے خبر از لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ است [۱۸۶]

(د) وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی اللہ کا ہمسر نہیں، کوئی قوم مسلمانوں کی بھی ہمسر نہیں۔

رشتۂ با لَمْ یَکُنْ باید قوی   تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی [۱۸۷]
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک   بندہ اش ہم در نسازد با شریک [۱۸۸]
خرقۂ لَا تَحْزَنُوْا اندر برش   اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش [۱۸۹]
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر   امر و نہی او عیارِ خیر و شر [۱۹۰]
خوار از مہجوریِ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی [۱۹۱]
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ   در بغل داری کتابِ زندۂ [۱۹۲]

(۲۰) عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ؐ

اس آخری باب میں علامہ نے سرکار مدینہ ؐ سے عرض کی ہے کہ حضور! مسلمان سرّ نبی ؐ سے بیگانہ ہو گیا ہے اس نے عرب سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اور عجمی خیالات عجمی تمدن اور عجمی وضع اختیار کر لی ہے۔ میں نے اسے قرآن کی طرف بلایا ہے۔

محفل از شمعِ نوا افروختم   قوم را رمزِ حیات آموختم[۱۹۳]

لیکن اگر میں نے قرآن کے علاوہ کسی اور شے کی طرف بلایا ہے تو بے شک آپ مجھے جو مرضی ہو سزا دیں۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است[۱۹۴]
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کن[۱۹۵]
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[۱۹۶]

اور اگر میں نے قرآن ہی کی طرف بلایا ہے تو پھر اتنی درخواست ہے۔

عرض کن پیشِ خدائے عزوجل   عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل[۱۹۷]

سب سے آخر میں علامہ نے سرکارِ مدینہ ؐ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ اپنی ایک دلی آرزو پیش کی ہے:

زندگی را از عمل ساماں نبود   پس مرا ایں آرزو شایاں نبود[۱۹۸]
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز   آرزو دارم کہ میرم در حجاز[۱۹۹]
از درت خیزد اگر اجزائے من   وائے امروزم خوشا فردائے من[۲۰۰]
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش   مرقدے در سایۂ دیوار بخش[۲۰۱]

علامہ کی یہ دعا اس قدر رقت آمیز ہے کہ کوئی صاحبِ دل بغیر چشم تر کیے اُسے ختم نہیں کر سکتا۔

خدا کرے علامہ کی یہ دعا قبول ہو اور علامہ کے علاوہ دیگر عاشقانِ رسول ؐ کو بھی یہ سعادت نصیب ہو۔ آمین

(’میثاق‘ جولائی و اگست ۱۹۶۹ء)

حواشی

۱ـ فقیر راقم الحروف نے دَوران قیام سیالکوٹ میں علامہ موصوف کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کیا تھا۔ تقریب بہر ملاقات یُوں ہوئی کہ مَیں نے ایک دن اپنے مکرم و محترم مولوی احمد دین صاحب مرحوم (والد بزرگوار حضرت اثر صہبائی مرحوم) سے عرض کی کہ میں والد علامہ اقبال، مولانا میر حسن اور علامہ عبدالحکیم مرحوم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ فرمانے لگے میرے ساتھ چلو ان سب سے ملادوں گا۔ چنانچہ ان کی معیت میں علامہ موصوف کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتوار کے دن، کوئی گیارہ کا عمل ہوگا، ہم دونوں پیدل روانہ ہوکر اس بزرگ کی خدمت میں جا پہنچے۔ شیخ صاحب موصوف کی عمر دسمبر ۱۹۲۸ء میں اَسّی اور نوّے کے درمیان ہوگی۔ ۸۵ سے بہرحال کم نہ تھی۔ بصارت اور سماعت دونوں میں فرق آگیا تھا۔ مولوی صاحب نے مجھے متعارف کیا۔ میں نے کہا مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج میں نے اس شخص کو دیکھا، جس کے گھر اقبال جیسا بلند اقبال پیدا ہوا جس نے ارسطو اور افلاطون کی صف میں اپنے لیے جگہ بنائی ہے جو فلسفۂ مغرب کا ماہر ہونے کے باوجود نبی اُمّی کا شیدائی ہے جس کے زورِ کلام اور رفعتِ تخیل نے مشرق اور مغرب دونوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ فرمانے لگے "یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ الخ" پھر مجھے حقہ دیا میں نے ان کی خاطر سے دو چار کش لگائے۔ مولوی صاحب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نہایت ذہین اور طباع انسان تھے۔ جوانی میں ان کی دکان سیالکوٹ کے شرفا اور زندہ دل لوگوں کا مرکز تھی۔ وہ سرسیدؒ کے بڑے حامی تھے اور اگرچہ تعلیم برائے نام تھی لیکن علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی عامی یا کم سواد انسان ہے۔ صورت ڈاکٹر اقبال سے بہت ملتی تھی۔ رنگ جوانی میں شہاب ہوگا اس عمر میں بھی رخساروں پر سرخی باقی تھی۔ معلوماتِ عامہ کا چسکا پڑا ہوا کب چھوٹتا ہے۔ دوسروں سے اخبار پڑھوا کر سنتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۲ـ میں نے مولانا کو دسمبر ۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر غالباً نوّے سال کی ہوگی۔ بصارت سے محروم ہو چکے تھے لیکن بصیرت کافی حاصل تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی جوانوں کو درسِ عبرت دیتی تھی۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اُردو، فارسی اور عربی کے نوکِ زبان تھے۔ میں نے نظیری کا ایک شعر پڑھا اور اس کے معانی دریافت کیے۔ فرمایا آپ تو ماشاء اللہ فارسی میں خاصی لیاقت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں تو کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے عرض کی کہ مقصود یہ ہے کہ شاگردی کا شرف

حاصل ہو جائے۔ آپ اقبال کے استاد ہیں جن کی شاگردی کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ پس اگر آپ سے یہ نسبت حاصل ہو جائے تو فخر و مباہات کا ایک پہلو بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ جائے گا اور میں ہم چشموں میں یہ کہہ سکوں گا۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

میری گفتگو سے قدرے محظوظ ہوئے اور فرمانے لگے "میاں ہمیں بھی استادوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا چسکا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں یہی شوق کشاں کشاں غالبؔ کی خدمت میں دلی لے گیا تھا۔ اس وقت سیالکوٹ میں ریل نہیں آئی تھی اس لیے وطن سے انبالہ تک گھوڑے پر سفر کیا تھا بعض موقعوں پر پیدل بھی چلنا پڑا۔ مگر شوق نے ساری منزلیں طے کرا دیں۔

مولانا کی دینداری اور علمیت کا حال بیان کر چکا۔ ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں۔ جوانی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا جب تک پیدل چلنے کی طاقت باقی رہی روزانہ بلا ناغہ اپنی والدہ کی قبر پر جاتے رہے۔ ایک سیپارہ جاتے اور ایک آتے ختم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ٥٦ سال تک جاری رہا۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۳؎ ڈاکٹر سر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ، سی آئی ای، ڈی لٹ، ایم اے ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے تھے۔ عجیب علم دوست اور ذہین و فطین اور بالغ نظر انسان تھا۔ عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی اور راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں سے نفرت نہیں تھی۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ دعوتِ اسلام جس کا ترجمہ سر سید کے ایما سے شیخ عنایت اللہ خلف شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ دہلوی نے کیا تھا ایسی کتاب ہے جو دراصل ہمارے علماء کو لکھنی چاہیے تھی لیکن بقول علامہ شبلیؒ ہمارے علماء اس سے کہیں زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً تکفیر اہل قبلہ، مسئلہ امتناعِ نظیر، مسئلہ امکانِ کذب، استنجا بالمدر اور بالماء، حلتِ غراب، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفعِ یدین، قیام در میلاد، صلوٰۃ قبل المنبر، جواز شیئاً للہ، انہدامِ قباب، تقبیلِ الابہامین، استمداد عن القبور، احضار صورتِ محمدیؐ، ایصالِ ثواب وغیرہ۔

اس کتاب سے ان کے تبحرِ علمی، وسعتِ معلومات اور اعلیٰ قابلیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

غالباً ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور آئے۔ یہاں انہوں نے تفسیر کبیر کے اقتباسات سے معتزلہ کے عقائد پر ایک رسالہ عربی زبان میں تالیف کیا تھا۔ جو لیوزک نے لندن سے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے یہ رسالہ ۱۹۲۵ء میں پڑھا تھا۔ چونکہ علم دوست تھے اس لیے انہیں علامہ اقبال

سے خاص انسیت ہو گئی تھی اور علامہ کو بھی اُن سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک نظم بھی ان کی یاد میں لکھی ہے جس کا عنوان ہے "نالۂ فراق":

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں   آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

پوری نظم بانگِ درا صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ فرمایئے۔

اِن کی آخری تصنیف ISLAMIC FAITH ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی اس کتابچے میں انہوں نے اپنے شاگرد (اقبال) کی خدمت میں بھی خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

۴ راستہ میں دہلی میں قیام کیا اور حضرت محبوب الٰہی ؒ کے مزار پر کمال حسنِ عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے اور کامیابی کے لیے دعا کی۔ یہ دعا ایک نظم کی صورت میں آج بھی باصرہ نوازی اور بصیرت افروزی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے اور بانگِ درا کے صفحہ ۹۷ پر مندرج ہے۔ پہلے بند میں توصیف ہے اس کے بعد التجا ہے'

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے   شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
پھر آرکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں   کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

فی الجملہ تمام نظم جذباتِ عالیہ سے معمور ہے ناظرین کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس نظم میں یہ شعر بھی تھا۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا   ملا ہے جن کے کرم سے یہ آستاں مجھ کو

مگر مطبوعہ نظم میں یہ شعر درج نہیں ہے۔

۵ DR. MCTAGGART ۱۹۲۳ء/۱۸۶۵ء کیمبرج میں فلسفہ کا پروفیسر تھا اس کے فلسفیانہ نظام کا اصطلاحی نام ONTOLOGICAL IDEALISM ہے۔ اس کی فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ چونکہ خودی (EGO) قائم بالذات اور ازلی ہے اس لیے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جین دھرم کا بنیادی عقیدہ یہی ہے۔

۶ DR. E-BROWN "تاریخ ادبیات ایران" چہار جلد کے شہرۂ آفاق مؤلف فارسی اور عربی کے بےنظیر محقق، نہایت شریف اور نیک نفس انسان، جس نے صدہا نوجوانوں کو سکالر اور ڈاکٹر اور نقاد بنا دیا کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ کثیر نادر الوجود فارسی مخطوطات اُن کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ بابی اور بہائی مذہب کے متعلق ان کی معلومات لائقِ رشک تھیں۔

۷ DR. R.A. NICHOLSON کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ بقیدِ حیات ہیں۔ مؤلف تاریخ ادبیاتِ عرب۔ شعبۂ تصوف سے خاص دلچسپی ہے۔ کئی کتابیں اس موضوع پر تالیف کی ہیں۔ زاویۂ نگاہ تنگ اور غیر ہمدردانہ ہے۔ اسرارِ خودی کا ترجمہ 'SECRETS OF THE SELF' کے نام سے شائع

کر کے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے۔

۸ (DR. SORLEY) کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفۂ اخلاق کے پروفیسر ہیں۔ عمر غالباً ۷۶ سال ہوگی۔ ان کی مشہور تصنیف MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو کیمبرج مدعو کیا تھا۔

۹ ۳۵ء میں میو روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔

۱۹۲۶ء میں آپ اپنے عقیدتمندوں کے اصرار سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے آمادہ ہوئے عموماً امیدوار ہزارہا روپیہ خرچ کرتے ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ ووٹر کی خوشامد وظیفۂ حیات بن جاتی ہے لیکن اہلِ لاہور جانتے ہیں کہ اقبال بغیر "منتِ مخلوق" کامیاب ہوا تھا۔

کونسل میں آپ نے برابر تین سال تک ملک اور قوم کی گراں بہا خدمات انجام دیں جن کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

دسمبر ۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیئے جو ۳۰ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوتے۔ وہاں سے آپ میسور بنگلور ہوتے ہوتے حیدر آباد دکن آتے۔ یہاں کی علمی مجلسوں کو نوازا۔ اور طالبانِ علم کی پیاس بجھائی۔

دسمبر ۳۰ء سرکار برطانیہ نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کر کے لندن بھیجا۔ (۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو محمد علی کا انتقال ہوا)

اکتوبر ۳۲ء میں تیسری کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔

ماہ دسمبر ۳۲ء میں لندن میں ARISTOTELIAN SOCIETY کے سالانہ جلسہ میں ایک معرکۃ الآرا مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے۔ "IS RELIGION POSSIBLE"

اس سفر میں آپ نے اسپین کا بھی دورہ کیا اور عربوں کی عظمت رفتہ کے آثار غرناطہ اور قرطبہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ فروری یا مارچ ۳۳ء میں واپس آتے۔

(واضح ہو کہ یہ مضمون ۳۳ء میں لکھا تھا اس لیے یہیں ختم ہو گیا۔)

۱۰ پہلی ملاقات جنوری ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔

۱۱ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے اب ۱۹۶۹ء میں میری رائے بدل چکی ہے۔

۱۲ اس مثنوی سے شاعری مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی بت پرستی یا بت گری مقصود ہے۔

۱۳ چونکہ عالم کی حیات زرِ خودی پر موقوف ہے اس لیے زندگی بقدر استواری ہے۔

؎۱۴ جب قطرہ خودی کا سبق حفظ یاد کر لیتا ہے تو اپنی بے قیمت ہستی کو موتی میں تبدیل کر لیتا ہے۔

؎۱۵ زندگی تو جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔

؎۱۶ دل سوزِ آرزو سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب وہ زندگی حاصل کرتا ہے تو غیرِ حق فنا ہو جاتا ہے۔

؎۱۷ زندہ انسان کو تمنا کی نفی مُردہ کر دیتی ہے (جس طرح) اگر شعلے میں سوز کم ہو جائے تو وہ (آخر کار) افسردہ ہو جاتا ہے۔

؎۱۸ علم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت کا سامان مہیا کرے اور خودی کی تقویم (پائداری) کے اسباب فراہم کرے۔

؎۱۹ خودی محبت سے پائندہ تر، زندہ تر، سوزندہ تر اور تابندہ تر ہو جاتی ہے۔

؎۲۰ عشق کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ اس کی اصل مادی نہیں ہے۔

؎۲۱ عشق کی بدولت نجد کی خاک چالاک ہو گئی۔ وجد میں آئی اور آسمان کے اوپر چلی گئی۔

؎۲۲ مصطفیٰ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہماری آبرو مصطفیٰ ہی کے نام سے ہے۔

؎۲۳ جنہوں نے دشمنوں پر رحمت کا دروازہ کھولا اور مکے کو لاتثریب (آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا) کا پیغام دیا۔

؎۲۴ انہوں نے نسب کے امتیازات کو بالکل فنا کر دیا ان کی تعلیم نے اس خس و خاشاک کو بھسم کر دیا۔

؎۲۵ گُلِ صد برگ کی طرح ہماری خوشبو بھی ایک ہی ہے سو وہی اس نظام کی جان ہیں اور وہ ایک ہیں۔

؎۲۶ کیا تو عشقِ رسولؐ کا مدعی ہے؟ اگر ہے تو پھر محبوب کی تقلید کر کے محکم ہو جا۔ تاکہ تیری کمند یزداں کو شکار (گرفتار) کر سکے۔

؎۲۷ تاکہ خدائے کعبہ تجھ پر نوازش فرمائے اور تجھے انی جاعلؑ کی شرح بنا دے یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام پر فائز فرما دے۔

؎۲۸ حضرت عمرؓ کی طرح اونٹ سے خود نیچے اتر۔ غیر کا احسان اٹھانے سے سو بار اللہ کی پناہ۔

؎۲۹ اپنا رزق دوسرے کے دسترخوان سے مت ڈھونڈ۔ آفتاب کے چشمے سے پانی کی موج مت مانگ۔

؎۳۰-۳۱ تاکہ تو پیغمبر کے سامنے اُس دن شرمندہ نہ ہو جو بہت روح فرسا ہوگا اس لیے اللہ سے ہمت طلب کر اور دنیا کا مقابلہ کر۔ دستِ سوال دراز کر کے ملتِ بیضا کی آبرو زائل مت کر۔

؎۳۲ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور چاند اس کی انگلی کے اشارے سے پھٹ جاتا ہے۔

؎۳۳ وہ خصوماتِ جہاں میں حکم (پنچ) بن جاتا ہے اور شاہانِ عالم اس کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔

؎۳۴ بے ہمتی سے صدہا امراض پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً کوتاہ دستی، بے دلی اور دوں ہمتی۔

؎۳۵-۳۶ چونکہ وہ (افلاطون) ذوقِ عمل سے محروم تھا اور اس کی جان وارفتہ معدوم تھی اس لیے وہ موجودہ

ہنگامے (کائنات خارجی) کا منکر ہوگیا اور اعیانِ نامشہود کا خالق بن گیا۔

۳۷ بہت سی قومیں اس کی شراب سے مسموم ہوگئیں اور سوگئیں اور اس لیے ذوقِ عمل سے محروم ہوگئیں

۳۸ اے وہ شخص کہ تیری ہتھیلی میں شاعری کی نقدی ہے۔ اس شاعری کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھ (کہ یہ شاعری سچی ہے یا کھوٹی)

۳۹ فکرِ روشن بینِ عمل کی طرف رہنما ہوتی ہے جس طرح بجلی کی چمک کڑک سے پہلے ہوتی ہے (اور اس کی طرف رہنما ہوتی ہے)

۴۰ تجھے لازم ہے کہ ادب میں فکرِ صالح سے کام لے اور اس کے لیے تجھے عربی شاعری کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔

۴۱ اے غفلت شعار! اطاعتِ الٰہی کی کوشش کر۔ اختیار، جبر (اطاعت) سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۴۲ ہر شے کا باطن قانون ہی سے قوی ہوتا ہے تو اس سامان سے کیوں غافل ہے؟

۴۳ آئین کی شدت کا شکوہ مت کر اور شریعت کی حدود سے باہر مت نکل۔

۴۴ جو شخص خود اپنے نفس پر حکمران نہیں ہے وہ ضرور دوسرے کا محکوم بن جاتا ہے۔

۴۵ جب تک لا الٰہ کا عصا تیرے ہاتھ میں ہے تو خوف کے ہر طلسم کو باطل کرتا رہے گا۔

۴۶ جو شخص بھی اقلیم لا میں آباد ہوگیا وہ عورت اور اولاد دونوں کی قید سے آزاد ہوگیا۔

۴۷ وہ ماسوائے اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے (اور) اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔

۴۸ نائبِ حق تو عالم کی روح کی مانند ہوتا ہے اس کی ہستی (دراصل) اسمِ اعظم کا ظل ہوتی ہے۔

۴۹ وہ جزو اور کل (انسان اور خدا) کے رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس جہان میں قائم ہوتا ہے

۵۰ وہ نوعِ انسانی کے لیے بشیر و نذیر ہوتا ہے وہ سپاہی بھی ہوتا ہے سپہ گر بھی ہوتا ہے اور امیر (سپہ سالار) بھی ہوتا ہے۔

۵۱ وہ علّم الاسما کا مدعا اور مقصود ہوتا ہے اور سبحان الذی اسریٰ کا بھید ہوتا ہے۔

۵۲ اس کی ذات، ذاتِ عالم کی تشریح ہوتی ہے اور اس کے جلال سے عالم کی نجات وابستہ ہوتی ہے

۵۳ اے تہذیبِ کہن کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک سے منحرف نہ ہو۔

۵۴ مسلمان کی طبیعت محبت کی بدولت قاہر ہے اور مسلمان اگر عاشق نہیں ہے تو کافر ہے۔

۵۵ اس کا دیکھنا اور نہ دیکھنا تابعِ احکامِ حق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا کھانا پینا اور سونا بھی۔

۵۶ اپنے ہر عمل سے قربِ حق مقصود رکھ تا کہ تیری ذات سے اس کا جلال آشکار ہو۔

۵۷ جو شخص غیر اللہ کی خاطر تلوار کھینچتا ہے (جنگ کرتا ہے) در اصل وہ اپنی تلوار اپنے ہی سینے میں پیوست کرتا ہے۔

۵۸ زندگی تو دوسروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا نام ہے اور اپنے آپ کو بیت الحرم (کعبہ) سمجھنے کا نام ہے۔

۵۹ مسلمان کا علم سوزِ دل سے کامل ہوتا ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں آفل کو ترک کر دینا۔

۶۰ دانشِ حاضر سے سوزِ عشق مت طلب کرو۔ حق کی کیفیت اس کافر کے جام سے مت مانگو۔

۶۱ دانشِ حاضر تو حجاب اکبر ہے۔ بُت فروش، بُت پرست اور بُت تراش ہے۔

۶۲ جو اللہ تعؐ کے جمال کا عاشق ہے وہی تمام کائنات کا سردار ہے۔

۶۳ میں کیا بتاؤں کہ اس شمشیر کا راز کیا ہے؟ اس کی آب زندگی سے اپنا سرمایہ (اپنا وجود) حاصل کرتی ہے۔

۶۴ حیدر کا ہاتھ جو کہ خیبر گیر تھا اس کی قوت اسی تلوار سے تھی۔

۶۵ تو کہ زمان کی اصل سے آگاہ نہیں ہے (اسی لیے) حیاتِ جاوداں سے آگاہ نہیں ہے۔

۶۶ زندگی دہر (زمان) سے ہے اور دہر زندگی سے ہے۔ اسی لیے نبیؐ کا فرمان یہ ہے کہ لا تسبّوا الدھر یعنی دہر کو بُرا مت کہو۔

۶۷ سازِ وقت نغمہ خاموش رکھتا ہے اور اگر تو زمان کے راز سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے دل میں غوطہ لگا۔

۶۸ عشق کو شعلِ لا سے آگاہ کر اور الا اللہ کے رمز سے آشنا کر۔

۶۹ میں تو تیرے لطف و کرم سے ایک ہمدم کا طالب ہوں جو میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو۔

۷۰ تاکہ میں اپنا سوز اس کے دل میں منتقل کر سکوں اور پھر اس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

۷۱ فرد ملت ہی سے احترام حاصل کرتا ہے اور ملت افراد ہی کی بدولت منظم ہوتی ہے۔

۷۲ جس شخص نے ملت کے زمزم سے پانی نہ پیا تو اس کے نغمات کے شعلے اس کے عود (ساز) میں فسردہ (مردہ) ہو کر رہ جائیں گے۔

۷۳ انسان کی فطرت آزاد بھی ہے اور مقید بھی ہے اور اس کے جزو میں کُل کو گرفت میں لانے کی قوت پوشیدہ ہے۔

۷۴ جماعت سے وابستہ رہ کر خودی خود شکن بن جاتی ہے لیکن اس کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ وہ خودی پھول کی پتی سے ترقی کر کے چمن ہو جاتی ہے۔

۷۵ ستاروں کی محفل جذب باہمی پر موقوف ہے اور ایک ستارے کی ہستی دوسرے ستارے کی بدولت محکم ہو

۷۶ نبی کہتا ہے کہ تو کسی انسان کا بندہ نہیں ہے اور ان بتانِ بے زباں سے کمتر نہیں ہے۔

۷۷ تاکہ انہیں ایک اور صرف ایک مقصد پر متحد کر سکے وہ (نبی) ان کے پاؤں میں قانون کی بیڑیاں ڈال دیتا ہے۔

۷۸ انہیں توحید کا نکتہ از سرِ نو سکھاتا ہے۔ نیز تسلیم و رضا کا قانون سکھاتا ہے۔

۷۹ خوف اور شک دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور عمل کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھ کائنات
کی مخفی طاقتوں کو دیکھ سکتی ہے۔

۸۰ جب عبدہٗ کا مقام محکم ہو جاتا ہے تو (مسلمان کا) بھیک مانگنے کا پیالہ جامِ جمشید بن جاتا ہے۔

۸۱ ملتِ بیضا بمنزلۂ تن ہے اور کلمۂ توحید اس کے حق میں بمنزلۂ روح ہے۔ یہ توحید ہی ہمارے سازِ
ہستی کے پردوں کو گردش دیتی ہے۔

۸۲ کلمۂ توحید ہی ہمارے تمام اسرارِ حیات کا سرمایہ ہے اور اس کا دھاگا ہی ہمارے تمام افکار کا شیرازہ ہے

۸۳ ملت کا وجود دلوں کی یک رنگی پر موقوف ہے اور یہ کوہِ سینا (ملت) ایک ہی جلوے سے منور ہے۔

۸۴ قوم کے افراد کے دماغوں میں ایک ہی تصور ہونا چاہیے اور اُن کے دلوں میں ایک ہی مقصود ہونا چاہیے۔

۸۵ نسب پر ناز کرنا نادانی ہے کیونکہ اس کا حکم صرف جسم پر نافذ ہے اور جسم فانی ہے۔

۸۶ ہماری ملت کی بنیاد کچھ اور ہی ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔

۸۷ ہم حضورؐ کی تعلیم کی برکت سے بھائی بھائی بن گئے ہیں اور یک زبان، یک دل اور یک جان ہو گئے ہیں۔

۸۸ اے مسلمان کہ تو غم کے زندان میں قید ہے اپنے نبیؐ سے "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" کی تعلیم سیکھ۔

۸۹ ایمان کی قوت تیری حیات کو بڑھا سکتی ہے اس لیے تجھے "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ" کا ورد کرنا چاہیے۔

۹۰ غیر اللہ کا خوف، عمل کا دشمن ہے اور زندگی کے قافلے کا رہزن ہے۔

۹۱ تیرے قلب میں جو بھی بُرائی پوشیدہ ہے اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی
بنیاد غیر اللہ کا خوف ہے۔

۹۲ جس نے بھی آنحضرت صلعم کی تعلیم کی روح کو سمجھ لیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ شرک
دراصل خوف میں پوشیدہ ہے یعنی جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ دراصل مشرک ہے۔

۹۳ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی ایمان کا عنوان ہے اور کچھ نہیں۔ غیر اللہ کا خوف (غیر اللہ سے ڈرنا) ہی شرکِ
پنہاں ہے اور کچھ نہیں۔

۹۴ نبیؐ مسلمان کے قلب و جگر کی قوت بن جاتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔

۹۵ ہم نے دینِ فطرت نبیؐ سے سیکھا اور اس طرح راہِ حق میں ایک شمع روشن کر دی۔

؎۹۶ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، دراصل خدا کا احسان ہے جو اُس نے بندوں پر کیا ہے اور یہ عقیدہ پردۂ ناموسِ مصطفیٰؐ ہے۔

؎۹۷ مسلمان کے دِل میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حریت کا عقیدہ اس کی ہستی کا سرمایہ ہے۔

؎۹۸ مسلمان امتیازات کو برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ مساوات کا عقیدہ اس کی نہاد (سرشت) میں سما گیا ہے

؎۹۹ وہ حق کے لیے خاک اور خون میں لوٹا۔ اس طرح وہ لا الہ کی بنیاد بن گیا۔

؎۱۰۰ مسلمان ماسوی اللہ کا غلام نہیں ہو سکتا اور اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھک سکتا۔

؎۱۰۱ ہم نے قرآن کی رمز حسین سے سیکھی اس کی آگ سے بہت سے شعلے جمع کیے۔

؎۱۰۲ تو مسلم ہے اس لیے اپنا دل کسی خاص اقلیم سے مت لگا اور اس جہانِ چون وچند میں گم مت ہو جا۔

؎۱۰۳ دل کی دولت حاصل کر کیونکہ یہ جہانِ آب وگِل دل کی وسعت میں گم ہو جاتا ہے۔

؎۱۰۴ ہجرت مسلمان کی زندگی کا قانون ہے یہ مسلمان کے ثبات کے اسباب میں سے ہے۔

؎۱۰۵ مچھلی کی طرح سمندر میں آباد ہو جا یعنی قیدِ مکاں سے آزاد ہو جا۔

؎۱۰۶ جو شخص قیدِ مکان سے آزاد ہو گیا وہ آسمان کی طرح کائنات میں آباد ہو گیا۔

؎۱۰۷ جس سیاست نے مذہب کی مسند پر قبضہ کر لیا تو مغرب کے گلشن میں یہ شجر پروان چڑھا۔

؎۱۰۸ نتیجہ یہ نکلا کہ جسم سے رُوح نکل گئی صرف جسم باقی رہ گیا آدمیت تو گم ہو گئی صرف اقوام باقی رہ گئیں۔

؎۱۰۹ مسلمان قوم خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور اس کی اصل "قالوا بلیٰ" کے ہنگامے سے ہے۔

؎۱۱۰ یہ قوم موت سے بے پروا ہے اور "نحن نزّلنا" سے استوار ہے۔

؎۱۱۱ چونکہ خدا نے "اَنْ یّطفِئُوا" فرمادیا ہے اس لیے یہ چراغ بجھ جانے سے محفوظ ہو گیا ہے۔

؎۱۱۲ مسلمان کی ہستی صرف آئین پر موقوف ہے۔ نبیؐ کے دین کا باطن صرف یہی ہے اور کچھ نہیں۔

؎۱۱۳ قرآنِ حکیم زندہ کتاب ہے اور اس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔

؎۱۱۴ اس کے الفاظ شک اور تغیر سے پاک ہیں اور اس کی آیات تاویل سے بے نیاز ہیں۔

؎۱۱۵ یہ کتاب نوعِ انسان کے لیے پیامِ آخریں ہے اور رحمۃ للعالمینؐ اس کے حامل ہیں۔

؎۱۱۶ اے مسلمان تو رسوم میں گرفتار ہو چکا ہے اور کفر کے طریقے تیرے حق میں رہزن بن گئے ہیں۔

؎۱۱۷ تُو نے "زبر" میں اپنے امر کو قطع کر دیا اور تو "الی شیءٍ نکر" کے صحرا میں جادہ پیما ہو گیا۔

؎۱۱۸ اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں جب تک تو صرف قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائے گا۔

۱۱۹ اگر تقلید کرنا کوئی نیک طریقہ ہوتا تو پیغمبرؐ بھی اپنے باپ دادا کے مذہب کی تقلید کرتے۔

۱۲۰ اپنے بزرگوں کی راہ پر چل کیونکہ جمعیت اسی صورت سے حاصل ہوگی۔ تقلید کا مطلب ہے ملت کے قانون کا اتباع۔

۱۲۱ توحید کا مطلب اپنے دل پر نقش کرلے اور تقلید سے اپنے طرزِ عمل کو درست کرلے۔

۱۲۲ انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کرنا گویا قوم کی بساط کو لپیٹ دینا ہے۔

۱۲۳ عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی کرنا بہتر ہے۔

۱۲۴ مسلمان یک آئینی سے زندہ ہے اور ملت کا جسم قرآن کی بدولت زندہ ہے۔

۱۲۵ ہم سب خاک ہیں صرف قرآن دل آگاہ ہے اسے مضبوطی سے تھام لے کیونکہ وہ "اللہ کی رسی" ہے۔

۱۲۶ کیا تو جانتا ہے کہ اس فرمان کا راز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ خطروں میں زندگی بسر کرنا ہی حقیقی زندگی ہے۔

۱۲۷ دینِ مصطفیٰ دینِ حیات ہے اور اس کی شریعت آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔

۱۲۸ جب سے مسلمانوں نے شعارِ مصطفیٰ ترک کر دیا اس وقت سے قوم رمزِ بقا سے محروم ہوگئی۔

۱۲۹ ایک مرید سے کہا کہ اے جانِ پدر! تجھے خیالاتِ عجم سے بچنا لازم ہے۔

۱۳۰ (کیونکہ) اگرچہ اس کی فکر آسمانوں سے بھی اونچی ہوگئی لیکن دینِ نبی کی حدود سے متجاوز ہوگئی۔

۱۳۱ اپنے دل کو حرفِ حق (قرآن) سے مضبوط کر عرب سے موافقت پیدا کر تاکہ تو مسلمان ہوسکے۔

۱۳۲ اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسلؐ سے مت توڑ۔ نیز اپنے فن اور اپنے قدم پر بھروسا مت کر۔

۱۳۳ اے مسلمان تو مصطفیٰؐ کی شاخ کا ایک غنچہ ہے اس لیے مصطفیٰؐ کی بادِ بہاری سے پھول بن جا۔

۱۳۴ تجھے اسیؐ کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیے اور اسیؐ کے خُلق سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہیے

۱۳۵ جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوگیا اسؐ کی رحمت عام ہے اور اسؐ کے اخلاق عظیم ہیں۔

۱۳۶ اگر تو اسؐ کے مقام سے دور ہے تو پھر ہماری جماعت میں سے نہیں ہے۔

۱۳۷ اُمتوں کی پیدائش کا قانون یہی ہے کہ زندگی کسی مرکز پر مجتمع ہوتی ہے۔

۱۳۸ قوم میں ربط اور نظام مرکز ہی سے پیدا ہوتا ہے اور مرکز ہی سے اس کی زندگی میں دوام پیدا ہوتا ہے

۱۳۹ بیت الحرام (مکہ) ہمارا راز دار بھی ہے اور راز بھی ہے اور بیت الحرام ہمارے لیے سوز بھی ہے اور ساز بھی ہے۔

۱۴۰ اسی نے ہم کو دنیا میں مشہور کیا اور اسی نے ہمارے حدوث سے قدم (ازلیت) کو وابستہ کر دیا۔

۱۴۱ مدعا ہی زندگی کے بقا کا راز ہے اور زندگی کی سیماب صفت قوتوں کو ایک نقطے پر جمع کرسکتا ہے

۱۴۲ جب زندگی کسی مقصد سے آشنا ہو جاتی ہے تو اس عالم کے اسباب کی ضابط ہو جاتی ہے۔

۱۴۳ مقصود عمل میں مثلِ روح پوشیدہ ہوتا ہے اور ہر عمل اُسی سے اپنی کیفیت اور کمیّت حاصل کرتا ہے

۱۴۴ چونکہ تیری ہستی کا راز تکبیر (اعلاء کلمۃ اللہ) میں پوشیدہ ہے اس لیے لا الٰہ الا اللہ کی حفاظت اور اشاعت تیرا فرضِ منصبی ہے۔

۱۴۵ جب تک ساری دنیا میں حق کی اشاعت نہ ہو جائے۔ اگر تو مسلمان ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی آرام مت کرنا۔

۱۴۶ ماسوا (کائنات) تسخیر کے لیے ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا سینہ تیرے تیروں کا نشانہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔

۱۴۷ اگر تو غنچہ ہے تو اپنی ذاتی سعی سے چمن تعمیر کر اور اگر تو شبنم ہے تو آفتاب کو مسخر کرلے۔

۱۴۸ اُٹھ اور اپنی مخمور آنکھیں کھول اور اس عالمِ مجبور کو بے قیمت اور بے کار مت سمجھ۔

۱۴۹ اس کا مقصد مسلمان کی ذات کی توسیع ہے اور مسلمان کی ذاتی قوتوں کا امتحان لینا ہے۔

۱۵۰ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو نیکوکاروں کے حصے میں دے دیا ہے اور اس کا جلوہ مومن کی آنکھ کے حوالے کر دیا ہے۔

۱۵۱ تو کہ خطابِ "انظر" کا مقصود ہے (اللہ نے انسان کو حکم دیا ہے کہ اونٹ کی تخلیق پر غور کرے) اس راستے (حیاتِ دنیوی) کو اندھوں کی طرح کیوں طے کر رہا ہے؟ (کائنات میں غور کیوں نہیں کرتا؟)

۱۵۲ علم اسما ہی سے آدم کی اولاد کی عزت ہے اور حکمتِ اشیا سے آگاہی کی بنا پر ہی وہ اپنی حفاظت کرسکتا ہے

۱۵۳ ربطِ ایام ہمارے لیے بمنزلۂ پیرہن ہے اور حفظِ روایاتِ کہن اس کے لیے بمنزلۂ سوئی ہے۔

۱۵۴ اے کہ تو اپنے سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ بتا تو سہی کہ تاریخ ہے کیا؟ کیا یہ کوئی داستان یا قصہ یا افسانہ ہے؟

۱۵۵ نہیں بلکہ یہ تجھے تجھ سے آگاہ کرتی ہے۔ تجھے آشنائے کار اور مردِ راہ بناتی ہے۔

۱۵۶ اگر تو حیاتِ لازوال چاہتا ہے تو اپنے ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے مت توڑ۔

۱۵۷ وہ جس کے وجود پر کائنات ناز کرتی ہے اُس نے عورت کا ذکر خوشبو اور نماز کے ساتھ کیا ہے۔

۱۵۸ جس مسلمان نے عورت کو کنیز سمجھا وہ قرآنی حکمت سے کوئی حصہ حاصل نہ کرسکا۔

۱۵۹ اگر تو غور سے دیکھے تو امومت ایک رحمت ہے کیونکہ اس کو نبوت سے ایک نسبت حاصل ہے۔

۱۶۰ عورت کی شفقت پیغمبرؐ کی شفقت سے مشابہ ہے اور اقوام کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔

۱۶۱ اُس مقصودِ حرفِ کن فکاںؐ نے فرمایا ہے کہ جنّت تو ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

۱۶۲ ملّت کا وجود ماؤں کی تعظیم پر موقوف ہے ورنہ کارِ زندگی خام ہے۔

۱۶۳ مائیں رمزِ اخوت کی محافظ ہوتی ہیں۔ اور قرآن اور ملّت کے حق میں ان کا وجود باعثِ تقویت ہوتا ہے۔

۱۶۴ بتولؓ تسلیم کی کھیتی کا حاصل ہے اور ماؤں کے لیے اسوۂ کاملہ ہے۔

۱۶۵ وہ صبر و رضا کی ادب پروردہ چکّی پیستی رہتی تھی اور قرآن کی تلاوت کرتی رہتی تھی۔

۱۶۶ ہمارا بچہ جب تیرا دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے تو سب سے پہلے تو ہی اسے لا الٰہ الا اللہ کہنا سکھاتی ہے۔

۱۶۷ تیری ہی محبت ہمارے اطوار کی تشکیل کرتی ہے اور ہماری گفتار، فکر اور کردار کی تشکیل کرتی ہے۔

۱۶۸ دورِ حاضر بہت عیّار اور مکّار ہے اس کا کارواں نقدِ دین کے لیے بمنزلۂ رہزن ہے۔

۱۶۹ اس کا ادراک اندھا اور خدا ناشناس (خدا کا منکر) ہے اور کم عقل افراد اس کے پیچاک میں گرفتار ہیں۔

۱۷۰ اے مسلمان خاتون! دنیا کے ہنگاموں سے ہوشیار رہ اور اپنے بیٹوں کو اپنی آغوش میں محفوظ کرلے۔

۱۷۱ ایک ہو جا اور ایک سے موافقت پیدا کر۔ دوئی سے تعلق قطع کرلے۔ اپنی وحدت کو پارہ پارہ مت کر۔

۱۷۲ ایک ہو جا اور توحید کو دیکھ لے اور اس کے غائب کو اپنے عمل سے موجود کرلے۔

۱۷۳ عمل میں ایمان کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جو عمل میں منتقل نہیں ہوتا۔

۱۷۴ بندہ حق بندۂ اسباب نہیں ہوتا۔ زندگانی رہٹ کی گردش نہیں ہے۔

۱۷۵ تو (چونکہ) مسلمان ہے اس لیے غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا اور اہلِ عالم کے حق میں سراپا خیر و برکت بن جا۔

۱۷۶ چونکہ راہ بہت دشوار ہے اس لیے کم سے کم سامان اپنے ساتھ رکھ۔ اس دنیا میں آزاد ہو کر زندہ رہ اور آزادی کی حالت میں رخصت ہو۔

۱۷۷ کیکاؤس کے تخت پر لات مار دے۔ سر (گردن) کٹا دے مگر عزتِ نفس کو ہاتھ سے مت دے۔

۱۷۸ بے نیازی کیا ہے؟ خدا کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا اور غیر کے رنگ کو اپنی شخصیّت سے مٹانا۔

۱۷۹ تو دراصل آفتاب ہے۔ کبھی اپنے اندر تو جھانک۔ دوسروں کے ستاروں سے چمک دمک حاصل مت کر۔

۱۸۰ تو کب تک محفل کے چراغ کا طواف کرتا رہے گا؟ اگر تیرے سینے میں دل ہے تو اپنی آگ میں جل۔

۱۸۱ باپ، ماں اور چچاؤں (نسبی تعلقات) سے فارغ ہو جا اور سلمانؓ کی طرح اسلام کا فرزند بن جا۔

۱۸۲ اگر تو نسب کو جزوِ ملّت بنالے گا تو اخوت کے نظام میں رخنہ پڑ جائے گا۔

۱۸۳ ہم نے تو محبوبِ حجازیؐ سے عشق کر لیا ہے اسی لیے ہم آپس میں مربوط ہو گئے ہیں۔

۱۸۴ صرف اسؐ سے محبت ہمارے باہمی تعلق کے لیے کافی ہے اور ہماری آنکھوں کے لیے صرف اس کی شراب کی کیفیت کافی ہے۔

۱۸۵ عشق جان میں ہوتا ہے جبکہ نسب جسم میں ہوتا ہے اور عشق کا رشتہ نسب سے محکم تر ہوتا ہے۔

۱۸۶ جو شخص بھی باپ دادا کی قید میں ہے وہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کے نکتے سے ناواقف ہے۔

۱۸۷ ہمارا رشتہ "لم یکن" سے قوی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ہم اقوامِ عالم میں بے مثال ہو سکتے ہیں۔

۱۸۸ چونکہ خدا کی ذات واحد اور لاشریک ہے۔ اس لیے اس کا بندہ بھی کسی شریک سے موافقت نہیں کر سکتا

۱۸۹ اس کے جسم پر "لَاتَحْزَنُوْا" کا خرقہ ہوتا ہے اور "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" کا تاج اس کے سر پر ہوتا ہے۔

۱۹۰ بندۂ مومن باطل کے سامنے بمنزلۂ تلوار اور حق کے سامنے بمنزلۂ سپر ہوتا ہے اور اس کا امر و نہی خیر و شر کے لیے بمنزلۂ معیار ہوتا ہے۔

۱۹۱ تو قرآن کو ترک کر کے دنیا میں ذلیل و خوار ہو گیا۔ اور اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر گردشِ دوراں کا شکوہ کرنے لگا

۱۹۲ اے شبنم کی طرح زمین پر گرنے والے مسلمان! آگاہ ہو کہ قرآن تیری بغل میں ہے جو زندہ کتاب ہے۔

۱۹۳ میں نے شاعری کی شمع سے محفل آراستہ کی اور قوم کو حیات کا راز بتایا۔

۱۹۴ اگر میرا دل آئینۂ بے جوہر (سیاہ) ہے اور اگر میرے کلام میں کوئی تعلیم غیرِ قرآنی ہے۔

۱۹۵ تو میری فکر کے ناموس کا پردہ چاک کر دیجئے اور ملت کے خیاباں کو میرے کانٹوں سے پاک کر دیجئے۔

۱۹۶ نیز قیامت کے دن مجھے خوار اور رسوا کر دیجئے اور اپنے پاؤں کے بوسے سے محروم کر دیجئے۔

۱۹۷ بارگاہِ ایزدی میں عرض کیجئے یعنی میرے لیے دعا کیجئے کہ میرا عشق عمل سے ہم آہنگ ہو جائے۔

۱۹۸ چونکہ میری زندگی اعمالِ صالحہ سے خالی ہے اس لیے مجھے یہ آرزو زیب تو نہیں دیتی (مگر)

۱۹۹ آپ کی شانِ رحمت تو گیتی نواز ہے (اس لیے) آرزو کرتا ہوں کہ میں حجاز میں وفات پاؤں۔

۲۰۰ اگر میرے جسم کے اجزاء آپؐ کے دروازے سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں تو اگرچہ میری موجودہ زندگی قابلِ افسوس ہے مگر آئندہ زندگی قابلِ تحسین ہو جائے گی۔

۲۰۱ میرے ستارے (مقدر) کو دیدۂ بیدار عطا فرما۔ اور اپنی دیوار کے سائے میں دو گز زمین عطا فرما۔

اقبال اور قرآن

سید نذیر نیازی

انجمن خدام القرآن کے مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے کچھ حقوق ہیں۔ ایک اسے ماننا، دوسرا پڑھنا، تیسرا سمجھنا، چوتھا عمل کرنا، پانچواں دوسروں تک پہنچانا۔ پھر ان پانچوں حقوق کو بعنوانات ذیل یوں ترتیب دیا ہے تاکہ ہم سمجھ لیں کہ یہ حقوق فی الواقع ہیں کیا اور باعتبار ان کے ہم پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

۱ : ایمان اور تعظیم
۲ : تلاوت اور ترتیل
۳ : تذکر اور تدبر
۴ : تحکم اور اقامت
۵ : تبلیغ اور تبیین

ایمان اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو صدقِ دل سے مانیں۔ ہر حالت میں اس کے ادب اور احترام کا خیال رکھیں۔ نہ کوئی ہستی اللہ تعالیٰ سے زیادہ واجب التعظیم ہے نہ اُس کے کلام سے بڑھ کر کوئی اور کلام واجبِ تعظیم و تکریم۔

تلاوت و ترتیل سے مراد ہے قرآن مجید کو جملہ آدابِ ظاہری و باطنی اور لوازمِ تجوید کے ساتھ خوش دلی اور خوش الحانی سے رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تاکہ اس کی تعلیمات ذہن نشین ہوتی جائیں۔ ہم خلوصِ نیت سے ان کے اتباع اور پیروی پر آمادہ رہیں۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ہر ارشاد بطور ایک حقیقت ذہن میں مستحضر رہے۔ ہم اسے کبھی نہ بھولیں۔ ہر حالت میں اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ تدبر کے معنی ہیں غور و فکر

اور اس سے مقصود یہ کہ ہم ان حقائق کا فہم اور ادراک پیدا کریں جن کی طرف قرآن مجید نے بکمالِ فصاحت و بلاغت جا بجا اشارہ کیا۔ بالفاظِ دیگر آیاتِ الٰہیہ کا مطالعہ و مشاہدہ جو انفس و آفاق میں بکھری پڑی ہیں۔ جن کا تعلق جہاں انسان اور کائنات سے ہے وہاں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بھی ہے تاکہ ہم سمجھیں کہ قرآن مجید کی دعوت کیا ہے۔ ہماری غایتِ حیات کیا عالمِ انسانی ہو یا عالمِ فطرت مشیتِ الٰہیہ اس میں کس طرح کار فرما ہے۔ ہم اپنی کنہِ ذات تک پہنچیں۔ یہ جان لیں اسے کائنات اور خالقِ کائنات سے کیا تعلق ہے۔ اس طریقِ زندگی میں جو ہمارے لیے تجویز ہوا کیا مصلحت ہے یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر انسان ہمیشہ سے غور کرتا چلا آیا اور غور کرتا رہے گا۔ لہٰذا قرآن مجید میں تدبر اور تفکر بھی ایک ایسا عمل ہے جس کی کوئی انتہا ہے نہ اختتام۔

حکم اور اقامت ہے قرآن مجید کے احکام کی منصفانہ پابندی اور ان سب فرائض کی جو اس طرح عائد ہوتے ہیں ہر حالت میں بجا آوری۔ اقامت وہ جدوجہد ہے جو اس نظامِ اجتماع یا معاشرہ کے قیام و استحکام میں لازم ٹھہرتی ہے جو قرآن مجید کا مقصود ہے اور جس کی ابتدا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اصولاً اور عملاً ہر پہلو اور ہر جہت سے واضح اور مکمل طور پر کر دی۔

تبلیغ عبارت ہے تعلیماتِ قرآنی کی ہمہ گیر اشاعت سے کہ ان سے دنیا کا کوئی انسان اور کوئی قوم بے خبر نہ رہے اور تبیین یعنی جیسا بھی موقع اور جیسے بھی حالات کا تقاضا ہے آیاتِ قرآنی کی توضیح و تشریح۔

آیئے اب ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کے پیشِ نظر یہ دیکھیں کہ اقبال نے ان حقوق کو کس طرح اور کہاں تک پورا کیا۔

سب سے پہلا فریضہ ایمان اور تعظیم ہے اور اسی سے ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے قرآن مجید کو ویسے ہی مانا جیسے ہر سچے مسلمان کا فرض ہے وہ صدقِ دل سے اس پر ایمان لائے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے لفظاً اور معناً حضور رسالت مآبؐ پر نازل ہوا اور بعینہٖ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی تعلیمات عالمگیر ہیں۔ دوامی اور ابدی، جن میں سرِ مو کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ تعظیم کا یہ عالم تھا کہ جہاں قرآن مجید کا ذکر آیا ان کا سر فرطِ ادب سے جھک گیا۔ چہرہ متغیر ہو گیا۔ بمصداقِ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ"۔ قرآن مجید کی عظمت کا احساس بڑھتا جاتا، کسی گہری فکر میں ڈوب جاتے۔ اس عالم میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ انہیں کے اس شعر سے کیجیے جس میں گویا اسی ارشاد باری تعالیٰ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ ... کی ترجمانی نہایت خوبی سے ہو گئی ہے:

آنچہ دوشش کوہ بارش بر نتافت سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

تلاوت کا فریضہ تو اس وقت تک جاری رہا جب تک علالت نے انہیں بے بس نہیں کر دیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور قرآن مجید ہی پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بچپن ہی سے نماز فجر کے بعد علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ بہ ادب بیٹھ جاتے۔ خوش الحان تھے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر غور کرتے، ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے تاکہ ہر لفظ اور ہر آیت کے معنی ذہن نشین ہو جائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ ہی ان کا محبوب ترین اور دل و دماغ کا سرمایہ تھا۔ ان کی غذائے رُوح ان کے لیے سرور و ابتہاج کا لازوال سرچشمہ۔ علالت کے ہاتھوں دم کشی اور حبسِ صوت کے باعث جب تلاوت سے معذور ہو گئے تو افسوس فرمایا ع

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

قرآن مجید سے ان کی شیفتگی اور والہانہ شغف کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی مصروفیت ہو، کیسا بھی انہماک، گھر بار کے معاملات، دنیا کے دھندے ان کا دل ہمیشہ قرآن مجید میں رہتا۔ دورانِ مطالعہ ہی اکثر رقّت طاری ہو جاتی۔ بآوازِ بلند تلاوت کر رہے ہیں تو آواز گلوگیر ہے آنکھیں پُرنم۔

تذکرے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کوئی گفتگو ہو، تحریر یا تقریر جہاں کوئی بات کہنے کی ہوتی ان کا ذہن بے اختیار ارشاداتِ قرآنی کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں کوئی حقیقت سامنے آئی، کوئی فکر ذہن میں ابھرا قرآن مجید کے حوالے سے اس کی وضاحت کر دی۔ مثالیں بہت ہیں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، ارضِ پاک و ہند میں ایک آزاد اسلامی قومیت کی تشکیل کا اوّلین اعلان تھا۔ اسلامی قومیت کی تشکیل اور وہ بھی صدیوں کے زوال و انحطاط، فرقہ آرائیوں اور فرقہ بندیوں کے بعد معمولی نصب العین نہیں تھا۔ اسلامی قومیت کے احیاء اور اسلامی قومیت کے قیام میں خطرے ہی خطرے تھے۔ اندرونی اور بیرونی بھی، اس کے لیے شدید جدّوجہد، بڑے صبر و استقامت، ایمانِ کامل اور

یقینِ محکم کی ضرورت تھی۔ یہ ایک آزمائش تھی جس میں قرآن مجید ہی سے تمسک اور قرآن مجید ہی کی رہنمائی سے پورے اُتر سکتے تھے۔ لہٰذا اقبال جب سب کچھ کر چکے تو سلسلۂ کلام اس ارشاد قرآنی پر ختم کیا۔ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ اور ظاہر ہے اس موقع پر اس سے زیادہ مناسب تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اگر ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے ہم راہِ ہدایت پر گامزن ہیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ بعینہٖ ۱۹۲۲ء میں جب عالمِ اسلام کا سیاسی اجتماعی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب کوئی سرزمین نہیں تھی جہاں مسلمان آزادی کا سانس لے سکے۔ جب ان حالات میں اقبال نے خضرِ راہ کے عنوان سے وہ مشہور نظم جو گویا شمع و شاعر کا تتمہ ہے پڑھی تو اس کا خاتمہ بھی اس ارشادِ باری تعالیٰ پر ہوا۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لاتخلف المیعاد دار

کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ یاس کفر ہے۔ قرآن مجید نے اہلِ یاس کا شمار اصحاب قبور میں کیا ہے اس دورِ ابتلا میں جب ہر طرف مایوسی ہی مایوسی چھا رہی تھی ’لاتخلف المیعاد‘ سے بڑھ کر امید و اعتماد کا پیغام اور کیا ہو سکتا تھا۔

رہا تدبر سو اس باب میں کیا عرض کیا جائے۔ محمد اقبال نے جو کچھ کہا جو کچھ سوچا، جو کچھ لکھا، شعر ہو یا فلسفہ قرآن مجید ہی میں تدبر اور تفکر کی بدولت۔ اس تدبر اور تفکر کی مثالیں پیش کرنا اس کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ یہ تو ایک مستقل موضوع ہے۔ مختصراً یہ کہ اقبال کا سرمایۂ فکر قرآن مجید ہی کی تعلیمات تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی شاعری اور افکار کا بغور مطالعہ کیجئے اس میں قرآن مجید ہی کی روح کارفرما ہے اور قرآن مجید ہی کی ترجمانی مقصود۔ اسرار و رموز اور خطبات کے علاوہ کتنی تحریریں ہیں جن کی اساس قرآن مجید ہی میں ان کا تدبر اور تفکر ہے۔ پھر یہی تدبر اور تفکر بانگ درا سے لے کر بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد، مسافر اور ارمغانِ حجاز میں ہر کہیں نمایاں ہے۔ بلکہ ان کی متفرق تحریریں، بیانات۔ تقریریں اور خطوط بھی اس سے خالی نہیں۔ گفتگوؤں میں بات ہر پھر کر قرآن مجید ہی کے معارف اور حِکم پر آجاتی .. زمانہ طالب علمی ہی میں جب انہیں قرآنِ مجید میں تدبر اور تفکر کا سبق دیا جا رہا تھا ان کے والد محترم بھی انہیں یہی نصیحت کرتے۔ ایک روز کہنے

لگے قرآن مجید پڑھتے تو ہو اسے سمجھتے بھی ہو۔ یاد رکھو قرآن مجید پڑھنے ہی سے نہیں دِل کے راستے سے بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسے پڑھو تو یوں سمجھو جیسے قرآن مجید تمہارے دل پر نازل ہو رہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس تدبر اور تفکر اور دل کے راستے سے قرآن مجید کو سمجھنے کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں بس دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک روز کہنے لگے فلسفہ ہو یا سائنس، زندگی اور اس کے مسائل، کوئی عقدہ ہو حل ہوتا نظر نہ آئے تو قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں۔ آئن شٹائن کا نظریۂ اضافیت شائع ہوا اور اس کے ماتحت یہ ماننا لازم ٹھہرا کہ کائنات اضافہ پذیر ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کئی دن سوچتا رہا بالآخر ایک روز اس پریشانی میں دفعۃً خیال آیا۔ کیوں نہ قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کروں۔ میں نے علی بخش کو پکارا علی بخش قرآن مجید لے آؤ۔ علی بخش قرآن مجید لایا اور میں نے اسے کھولا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب پہلی آیت جس پر میری نگاہ پڑی یہ تھی "وَاللّٰهُ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ" میں سمجھ گیا۔ میری مشکل حل ہو گئی۔ ایسے ہی نیٹشے کا فوق البشر زیر بحث آیا تو میں نے درخواست کی کہ اس باب میں دانستہ یا نادانستہ جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں یا کر دی گئیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ ناقدین نے فوق البشر کا سلسلہ خواہ مخواہ نائبِ حق سے جوڑ رکھا ہے۔ فرمایا میں تو ان کا کب سے ازالہ کر چکا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے میرے ناقدین اسے غور سے کیوں نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا میں انہیں کے خیال سے کچھ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان غلط فہمیوں کے پیش نظر چند ایک باتوں کی ایک حد تک وضاحت ہو جاتے اور وہ بھی آپ کی طرف سے تو اچھا ہو گا۔ فرمایا اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو کل سہ پہر کا وقت مناسب رہے گا۔ ذرا جلدی چلے آنا۔ دوسرے روز حاضر خدمت ہوا اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا تو فرمایا یہ سامنے کی الماری میں قرآن مجید رکھا ہے۔ قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ میں اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے شاید فلسفہ کی بعض کتابوں کی ورق گردانی کے لیے کہا جائے گا۔ میں قرآن مجید لے آیا تو ارشاد ہوا۔ سورۃ الحشر کا آخری رکوع نقل کر لو۔ رکوع نقل کر چکا تو پھر چند ایک عنوانات کے ماتحت یکے بعد دیگرے مختصراً کچھ شذرات لکھواتے گئے۔ یہ دن تھا جب میں پورے طور سے سمجھا کہ اقبال نے نائبِ حق کا جو تصور قائم کیا اس کی اساس

فی الحقیقت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ علم و حکمت اور فکر و فرہنگ کی ساری دنیا ہمارے سامنے ہو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ دنیا بتمام و کمال ہمارے سامنے آئے گی تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتے تو قرآن مجید کا رشتہ علم و حکمت سے جس طرح قائم ہے اور علم و حکمت کا قرآن مجید سے اس کا سمجھنا بہت بڑی بات ہے۔ ایک روز گفتگو تھی کہ اس عہد نے جسے سائنس کا عہد کہا جاتا ہے، مذہب کے بارے میں بڑی بدگمانیاں پیدا کر دیں بلکہ اس کے خلاف ایک معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ فرمایا یہ اس لیے کہ لوگ علم و حکمت کی صحیح روح سے واقف ہیں نہ قرآن مجید سے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ ارشاد ہوا اور انگریزی میں اسلام خلاصۂ کائنات ہے (EPITOME OF THE UNIVERSE) اور یہی رائے ہمارے علماء کی بھی۔ مگر یہ حقیقت جب ہی منکشف ہوگی جب ہم قرآن مجید میں تدبر اور تفکر سے کام لیں۔ قرآنِ مجید میں تدبر اور تفکر کیجیے تو علم و حکمت ہو یا کوئی اور صداقت ہمارا رشتہ آپ ہی آپ اس سے قائم ہو جائے گا۔ یہ جو اقبال کے اشعار میں تعلیماتِ قرآنی کی برجستہ اور بے ساختہ ترجمانی ہوتی رہتی تھی تو اسی تدبر اور تفکر کی بدولت۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآنِ مجید ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس میں تدبر اور تفکر کا عمل بھی ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔

حکم کو لیجیے تو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اقبال کے نزدیک انسان کے لیے کوئی اساسِ فکر اور اساسِ عمل ہے تو قرآنِ مجید اور صرف قرآن مجید۔ حکم کے معنی بہت وسیع ہیں۔ یہ ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے مراد ہے ان سب اوامر و نواہی کی غیر مشروط پابندی جو از روئے معروف و منکر اور حرام و حلال شریعت نے ہم پر عائد کیے اور جن کی بجا آوری سے فرد کی سیرت اور جماعت کا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو ہماری تعلیم اور تربیت کا سرچشمہ اور اس عمارت کی اساس ہیں جسے اسلامی نظامِ حیات یا اسلامی طریقِ زندگی یا اصطلاحاً جو جی چاہے کہہ لیجیے اور جو ساری نوعِ انسانی کو ایک اصول اور قانون پر جمع کرتے ہوئے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جسے اس کی فطرت کہیے جسے خالقِ فطرت نے خود اس کے لیے تجویز کیا۔ مختصراً یہ کہ حکم کا تقاضا ہے اقامتِ دین۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی ہر پہلو سے عملاً اور واقعۃً ترجمانی۔ لہٰذا اس معاشرے کی تعمیر جو وحدتِ بشری کی تمہید ہے اور جس کے لیے ایک آزاد اور با اقتدار، مخصوص و متمیز اور جداگانہ سیاسی

اجتماعی گروہ بندی ناگزیر ٹھہرتی ہے جس کے بغیر ناممکن ہے فرد یا جماعت کی زندگی اسلام کے معیار پر پوری اترے۔ یہی وہ جدوجہد ہے جس میں چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری میں ہمارے ایمان اور صبر و استقامت کا امتحان ہوتا ہے اور جس کا، جب ارضِ پاک و ہند کی سیاست ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی، وقت آیا اور اقبال نے قوم کو یاد دلایا کہ ہم نہ بھولیں بحیثیت قوم ہمارا فریضہ کیا ہے، ہماری حیاتِ اجتماعیہ اور قومی تشخص کا راز کیا۔ لہٰذا اس مرحلے میں ہمارا موقف کیا ہونا چاہیے تو ان کی مخالفت میں غیروں کی طرف سے جو آواز اٹھی اس میں ایک حد تک اپنوں نے بھی حصّہ لیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر اسلام محض ایک عقیدہ نہیں کہ ہم نے اسے مانا اور اپنی ذاتی اور نجی زندگی سے باہر اس پر عمل سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ ایک دستورِ حیات جس کے افہام و تفہیم کے لیے انبیا علیہم السلام تشریف لاتے جو حضورؐ رحمۃ للعالمین کی بعثت کے ساتھ بطور ایک دینِ کامل افراد و اقوام کی زندگی لہٰذا امورِ انسانی میں ہمیشہ کارفرما تھا آج بھی ہے اور رہے گا اگر اس دستورِ حیات کی ترجمانی ایک نظامِ مدنیت کی شکل میں نہیں ہوتی۔ اگر اس کی بنا پر ایک ایسی قوم وجود میں نہیں آتی جس کا ضمیر خالص انسانی اور نقطۂ نظر لسانی، جغرافی، نسلی عصبیتوں سے بالاتر محض انسانیت پر مرکوز ہے تو کوئی بھی جدوجہد ہو سیاسی یا اجتماعی ذہنی یا اخلاقی اس سے کیا حاصل! یہ ایک سیدھی سادی سی بات تھی جس میں کوئی ایچ پیچ نہیں تھا مگر جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ اگر اسلام ایک عالمگیر دعوت ہے، اگر اس کا خطاب ساری دنیائے انسانی اقوام اور اُمم سے اور عالمِ تاریخ سے ہے لہٰذا کسی ایسے نصب العین پر جس سے بحیثیت ایک نوع ہماری تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے اور یہی فی الحقیقت تہذیب و تمدن کی اساس۔ اگر مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کردار ہے کوئی فریضہ ہے جو عالمِ بشری کی ہدایت اور خیر و سعادت کے لیے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہم اسے آزادی و اقتدار ایک قوم کی حیثیت ہی سے جیسا کہ زبانِ سیاست میں اس کا مفہوم ہے اور جس کے لیے "خیرِ امت" کی تشکیل ہوئی ادا کر سکتے ہیں۔ نہ اسلامی قومیت کسی دوسری قومیت میں ضم ہو سکتی ہے نہ اس کے دستورِ حیات میں کسی دوسرے دستورِ حیات کا پیوند لگ سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہم اپنا ملّی تشخص قائم رکھیں۔ پھر جب اس ملّی تشخص کے شعور ہی سے ہماری تعلیم و تربیت میں کچھ معنی پیدا ہوتے اور ہمارا قومی وجود قائم ہے تو حق و باطل

میں شرکت کے کیا معنی۔

باطل دُوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ فریضہ ہے جس کی انہوں نے عمر بھر تلقین کی جس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی شعر ہو یا فلسفہ، ادب اور فن یا سیاسی اور ملّی زندگی کا کوئی گوشہ وہ جہاں کہیں بھی اور جس حال میں تھے، اسی نصب العین پر قائم رہے اور یہی اوّل و آخر ان کی آرزو رہی کہ اُمّت اپنے اصل الاصُول پر آجائے۔ عصرِ حاضر کا انسان اپنی سعی و محنت، اپنی عقل و فکر کی تازگی اور علم و ہُنر کی نادرہ کاری سے جو دنیا پیدا کر رہا ہے، زندگی نے جو انقلاب انگیز کروٹ لی ہے، ارباب نظر جس نئے اور تابناک مستقبل کا جو خواب دیکھ رہے ہیں مسلمان اس سے غافل نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک موقع دیا ہے اسی میں ان کا امتحان ہے۔ وہ اُٹھیں، اپنے ایمان و یقین کی تجدید کریں اور اس دنیا کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں جو اسلام کا مقصود ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان کی گفتگو کا کوئی موضوع تھا تو یہی اور یہی ہر ایک سے ان کا کہنا حتیٰ کہ علالت کے آخری ایام میں جب ان کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کوئی خیال تھا تو یہی، کوئی پریشانی تھی تو یہی۔ چنانچہ یہ انہیں کا یمان و یقین بصیرت اور فراست تھی کہ ارض پاک و ہند کی بساطِ سیاست دیکھتے دیکھتے بدل گئی۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مرڈے خود آگاہے

مسلمانوں نے جان لیا ان کے مستقبل کا راز کیا ہے، ان کے لیے صحیح راہ عمل کیا۔

بات طویل ہو رہی ہے کہنا یہ ہے کہ اقبال کا کوئی پیغام تھا تو یہی کہ مسلمان سمجھ لیں ان کی زندگی قرآن مجید سے ہے۔ قرآن مجید میں فکر و نظر سے کام لیں۔ اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ قرآن مجید ہی ان کا ایک سرمایہ ہے۔ یہی ان کا پیغام تھا جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا شعر میں، فکر میں تحریر و تقریر میں، گفتگوؤں میں، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کوئی معاملہ ہو، کوئی مسئلہ، علم و حکمت کی بحث ہو، تہذیب و تمدن یا ادب اور فن، سیاست اور معاش، فرد کی زندگی، جماعت کے مفاد، انسان، اس کے ضمیر اور باطن، احوال و واردات امور عالم کی غرضیکہ کوئی موضوع ہو بالآخر قرآن مجید ہی پر ختم ہوتا۔ قرآن مجید ہی نے ان کے فکر کو جلا دی۔ قرآن مجید نے ہی ان کی شاعری

میں وہ کیفیت، وہ درد و سوز اور ذوق و شوق پیدا کیا جس کا سرچشمہ ایمان میں نے عرض کیا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور اگر ہم نے اقبال کو سمجھ لیا ہے تو جیسا کہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اس تعلیم کا خاتمہ بھی قرآن مجید ہی پر ہوا۔ آخری عمر میں بھی ان کی کوئی خواہش تھی تو یہی کہ قرآن مجید کے معارف اور حکم پر قلم اٹھائیں۔ زندگی کے آخری لمحے آئے تو یہی آرزو کہ قرآن مجید سنیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ جب زندگی ہو یا آخرت اس کا رشتہ قرآن مجید ہی سے وابستہ ہے انہوں نے کہا ہے اور خوب کہا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن اس "بقرآن زیستن" کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جد و جہد میں جو نوع انسانی کو ازل سے درپیش ہے، جس میں تاریخ کی حیثیت ایک لمحے کی ہے، جس میں اقوام و امم یکے بعد دیگرے ایسے ابھرتی ہیں جیسے کسی بہتی ہوئی ندی میں پانی کے بلبلے، جس میں تہذیب و تمدن نے کئی رنگ بدلے، چشم فلک نے کئی انقلاب دیکھے اور جس کا سلسلہ اس لیے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ انسان اپنے مدعا و منتہا کو پالے، ہم اس جد و جہد میں مردانہ وار حصہ لیں۔ اسے اسلام کے قالب میں ڈھال دیں۔ یہ مقصد وعظ و نصیحت اور تحریر و تقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن مجید پر عمل کرنے سے

اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم   تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن   نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

یہ اس لیے کہ زندگی کو ثبات ہے۔ اس کی تقویم کا کوئی نسخہ، اس کے امکانات کے حصول کا کوئی راستہ، اس کی غایت اور کنہ میں ادراک کا کوئی ذریعہ ہم سمجھ لیں اس کا رُخ فی الحقیقت کس طرف ہے تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ یہی ہماری تعمیر ذات اور یہی ایک ایسی زندہ و پائندہ شخصیت کی اساس ہے جسے موت کا ہاتھ بھی فنا نہیں کر سکتا، قرآن مجید ہی اس محکم اور ترقی پذیر نظام تمدن کا صورت گر ہے جس کی ساری نوعِ انسانی کو ضرورت ہے۔ وہ ایک عالمگیر اور ابدی پیامِ ہدایت ہے جو ہمارے لیے مژدۂ حیات لے کر آیا جس میں ہمارا ہی ذکر ہے، جسے یاد رکھنے کے لیے آسان کر دیا۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ" جو عین صداقت ہے، عین علم و حکمت، سراسر دستور و قانون، سراسر موعظت اور رحمت!

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم   حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخرین   حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمین!

اب اگر ہمیں زندگی کی نعمت ملی ہے، ہمارے نزدیک اس کے کچھ معنی ہیں، ہم اس کی تب و تاب محسوس کرتے، اس کے ذوق و شوق اور سوز و ساز کے لذت آشنا ہیں، ہمارے سینوں میں بھی وہی آرزوئیں اور تمنائیں پرورش پا رہی ہیں، وہی عزائم اور مقاصد اُبھر رہے ہیں جن کا تعلق جہاں داری اور جہاں بانی سے ہے، عالمِ محسوس کی تسخیر اور ایک برتر تہذیب و تمدن کے نشوونما سے، ایک ایسی دنیا کا تصور ہیں جو عمل پر اُکسا رہا ہے جس میں انسانیت کا جوہر کھلے، جس میں زندگی کو اس کے سارے جمال و جلال کے ساتھ عالم خارج میں مشہور دیکھیں جس میں نت نئے حقائق اور نت نئے مدارجِ ذات سے لطف اندوز ہوں تو اس میں کامیابی کا رشتہ قرآن مجید ہی سے جوڑنا پڑے گا۔ پھر اس باب میں اقبال کا خطاب اگرچہ ساری نوعِ انسانی سے تھا لیکن اس شخص سے بالخصوص جو مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے کہ سب سے زیادہ اسی کا فرض ہے کہ اس جد وجہد میں حِصّہ لے۔

چوں مسلمانان اگر داری جگر   در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست   عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است   گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن زِ آیاتِ خدا است   ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش   می دہد قرآں جہانے دیگرش
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ہم بھول گئے قرآن مجید ہی سے ہمارا قومی وجود قائم ہے۔ قرآن مجید ہی ہمارے ملی تشخص کا راز، ہمارا آئین، ہمارے لیے اصول و قوانین کا سرچشمہ۔ مگر ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتاب زندۂ

پھر جس طرح اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے خواہ دنیا بھر کے درخت قلم اور سمندر روشنائی بن جائیں، بعینہ ان کی تشریح و تفسیر تبلیغ و تبیین کا بھی کوئی اختتام ہے نہ انتہا، عقل طرح طرح سے ان کی طرف بڑھے گی۔ فکر ایک کے بعد دوسرا تصور قائم کرے گا۔ علم پر نئے نئے حقائق منکشف ہوں گے عمل سے کتنی ایک عقدوں کی گرہ کھلتی رہے گی۔ لہٰذا ایک بات ہے جس کا اس ضمن میں سمجھ لینا ضروری ہے جس کی طرف اگرچہ اقبالؔ نے اشارہ بھی کر دیا تھا مگر جس پر بہت کم توجہ کی گئی اور وہ یہ کہ زندگی چونکہ سرتاسر خلاقی اور تازہ کاری ہے اس لیے تجربے اور مشاہدے کی طرح علم و حکمت اور فکر و وجدان کی دنیا بھی ایک تغیر پذیر دنیا ہے سا ہی سے اس کی ہستی اور وجود قائم یہی اس کی حرکت اور یہی اس کی طلب اور جستجو کا راز۔ وہ ایک لامتناہی سفر ہے جس میں اگرچہ کوئی مرحلہ اور کوئی ساعت آخری نہیں لیکن جس میں ہم لازماً کسی مقام پر ہوں گے اور اسی مقام سے ماضی و حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خاص موقف قائم کرتے ہوئے ایک نئی امید اور نئے اعتماد کے ساتھ منتظر رہیں گے کہ ہماری طلب و جستجو سے جو حقائق واشگاف ہوئے مستقبل میں وہ کس انداز میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ بعینہٖ جیسے ایک کوہ پیما ایک بلندی سے دوسری بلندی کی طرف بڑھتا ہے تو اگرچہ وہی مناظر بار بار اس کے سامنے آتے ہیں جن کو وہ اس سے پہلے دیکھ آیا تھا مگر اب ہر لحظہ ایک نئے رنگ میں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عقل اور فکر کا ہے۔ کہ ہمارے وہ تصورات بھی جن کو ہم آخری اور قطعی سمجھتے ہیں، آخری اور قطعی نہیں ہوتے۔ حقیقت ایک ہے اور لامتناہی۔ جیسے جیسے ہم عقل اور فکر کے سہارے اس کی طرف بڑھیں گے ہمارے وہ تصورات بھی جو قطعی اور یقینی لہٰذا خالی از صداقت نہیں تھے، ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ نئے نئے تصورات قائم ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن ایک خاص وقت میں جب حقیقت کا کوئی پہلو لیا گیا ہوا اور اس موقف کی رعایت سے جو ایک خاص عمر میں عقل اور فکر نے قائم کیا کیونکہ بغیر اس کے کوئی دوسرا موقف ممکن ہی نہیں تھا تو ہم جو کچھ کہیں گے اس موقف کا لحاظ رکھتے ہوئے تاکہ اسے دوسروں تک پہنچا سکیں، مگر جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم نے حقیقت کو موقف یا اس طرح جو تصورات قائم ہوئے ان کے تابع کر دیا۔ جس ذہنی فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کی برتری

تسلیم کرلی۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ کہا محض سہولتِ افہام و تفہیم کے لیے۔ یہاں پھر ایک مثال سے کام لینا بہتر ہوگا جس سے اس امر کی مزید وضاحت ہوجائے گی کہ اقبال کے فکر کی نوعیت فی الحقیقت کیا ہے۔ انہوں نے آیتِ نور "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے بارے میں جب ایک مغربی مصنّف کے خیال کی، جس نے اسے ایک خاص دعوے کی تائید میں پیش کیا تھا تردید کی اور کہا اس آیت کا اشارہ اس حقیقت کی طرف نہیں ہے جو مصنّف کے ذہن میں ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں ایک دوسری حقیقت کی طرف تو اعتراض ہوا کہ اقبال نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے صحیح نہیں۔ صحیح تاویل کچھ اور ہے جسے میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اپنے ایک عنایت نامے میں لکھا کہ تاویل تو معترض کر رہا ہے۔ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ مصنّف مذکور کے نزدیک اس آیت کا اشارہ جس حقیقت کی طرف ہے صحیح نہیں۔ میں تاویل کا قائل نہیں ہوں میرا مذہب اس معاملے میں وہی ہے جو ابن حزم کا اور جسے مولانا روم نے اپنے اس ارشاد میں کس خوبی سے ادا کر دیا ہے۔

کردہ تاویل حرفِ بکر را   خویش را تاویل کن نے ذکر را

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس حرفِ بکر کے معنوں کی از روئے فکر و تحقیق فلسفہ کی نفی نہیں ہوتی۔ نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اپنے خیالات کے جواز میں کوئی عقلی حیلہ تراش رہے ہیں مگر بات پھر طول کھینچتی رہی ہے۔ مجھے چاہیئے سلسلہ کلام ختم کر دوں۔ بیان ہے ان حقوق کا جو قرآن مجید کی طرف سے مسلمانوں پر عاید ہوتے اور اقبال کے قرآن مجید میں ایمان و یقین کا ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

بہتر ہوگا میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ آپ نے میری معروضات توجہ سے سُنیں، سلسلہ کلام اقبال ہی کے اس قطعے پر ختم کر دوں۔

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز   دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردار خود را   قیامت ہائے پیشین را بر انگیز

(ماخوذ از 'میثاق' جنوری فروری ۱۹۷۴ء)

* * *